ڈاکٹر ذاکر حسین

(شخصیت اور کارنامے)

مرتب

پروفیسر گوپی چند نارنگ

اردو اکادمی دہلی

سلسلۂ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۱۰۲

TITLE : DR. ZAKIR HUSAIN :SHAKHSIYAT AUR KARNAME
Edt. by : PROF. GOPI CHAND NARANG
Published by : URDU ACADEMY, DELHI
Print : 1998
Price : Rs. 70/=

قیمت ستر روپے
سنِ اشاعت ۱۹۹۸
طباعت : ثمر آفسیٹ پریس، دہلی
ناشر و تقسیم کار اردو اکادمی دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی

ISBN 81-1721-106-2

فہرست

عنوان	مضمون نگار	صفحہ

حرفِ آغاز

ستاں کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں
نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی
صل ہے۔ آزاد ہندوستاں کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و
می کہی جاسکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے
نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں
اپا کر اس عظیم تہذیب کی ترجماں بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام
ی زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر
ے کے ایما پر (جو اس وقت ملک کی وزیر اعظم تھیں) ۱۹۸۱ء میں دہلی
اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا
آغاز کیا۔ آج دلّی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و
ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کارہائے نمایاں انجام دے
رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک یہاں تک کہ بیرونی ممالک کے اردو حلقوں
میں بھی کافی مقبولیت حاصل ہے۔ یہاں یہ اعتراف ضروری ہے کہ اس کام میں اردو
اکادمی کو دہلی سرکار کا فراخدلانہ تعاون حاصل رہا ہے۔

اکادمی کے دستورالعمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیر اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور معلموں میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کر چکی ہے۔ انھیں سرگرمیوں میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی ماہنامہ "ایوان اردو" اور بچوں کا ماہنامہ "امنگ" کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلی معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین بلاشبہ ان شخصیتوں میں تھے جنھیں ہمہ صفت موصوف کہا جاسکتا ہے۔ ان کا خصوصی شعبہ اقتصادیات تھا لیکن انھوں نے تدریس و تعلیم کے میدان میں بھی امتیاز حاصل کیا اور اپنے تفکر و تدبر سے ادب و سیاست کی راہیں بھی روشن کیں۔ ہندوستان کے قومی رہنماؤں بالخصوص گاندھی جی کے خیالات سے متاثر ہو کر انھوں نے زمانۂ طالب علمی ہی میں فکر و عمل کا جو راستہ اختیار کیا وہ شخصی منفعتوں کی بجائے قومی مفادات کی پاسداری کا راستہ تھا۔ قومی معادات کی اسی پاسداری میں انھوں نے اپنی مادر درسگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو، جس پر ان دنوں غیر ملکی حکمرانوں کو بالادستی حاصل تھی، خیر باد کہا اور آزاد قومی درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے بعد اس کی تعمیر و ترقی کے لیے تن من دھن کی بازی لگادی۔ جامعہ کے قیام کا مقصد تعلیم کو قومی تقاضوں کا تابع بنانا تھا۔ ذاکر صاحب اور ان کے رفقائے کار نے اس مقصد کے حصول کے لیے جو قربانیاں دیں وہ بے مثال ہی کہی جائیں گی۔ پھر آزادی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نظم کچھ بگڑتا نظر آیا تو اس کی باگ ڈور بھی ذاکر صاحب کو سونپی گئی اور ان کے انتظامی اور اصلاحی اقدامات سے یہ قومی ادارہ مزید ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ واردھا تعلیمی اسکیم کے خط و خال متعین کرنے میں بھی ذاکر صاحب نے اہم حصہ لیا جسے مہاتما گاندھی کی

سرپرستی حاصل تھی۔

اردو زبان اور اس کے شعر و ادب سے ذاکر صاحب کے شغف کی اولین یادگار غالب کی وہ قیاسی تصویر ہے جو انھوں نے جرمنی کے زمانۂ قیام میں تیار کرا کے شائع کی اور جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آزاد ہندوستان میں انھوں نے اردو کے حقوق کی بازیابی کی جس تحریک کی رہنمائی کی، عوامی پذیرائی کے باوجود بظاہر وہ ناکامی پر منتج ہوئی لیکن اس کا یہ اثر ضرور ہوا کہ اردو والوں کی خود اعتمادی بحال ہوئی اور ان میں اپنے حقوق کے حصول کے لیے جمہوری عزم بیدار ہوا جس کے مثبت نتائج سامنے آنے لگے ہیں۔

ذاکر صاحب ادیب ہونے کے دعویدار نہیں تھے لیکن انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے جو بڑوں کے لیے بھی ہے اور بچوں کے لیے بھی۔ انھوں نے اپنے اعزہ و احباب یا دوسرے لوگوں کو جو خط لکھے ہیں، ان میں سے بہت سے خط شائع ہو کر منظر عام پر آگئے ہیں اور یہ کہنا تحصیل حاصل ہوگا کہ ان کے خطوں میں بھی ادبیت کی شان پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریریں، خواہ وہ ان کے خطبات ہوں یا خطوط، یا وہ کہانیاں جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھیں، ان کے انھی خیالات و احساسات کی ترجمان ہیں جن کا اظہار ان کی عملی زندگی میں ہمیشہ ہوتا رہا۔ ذاکر صاحب سادگی میں قناعت، انکسار میں وقار اور راسخ العقیدگی میں کشادہ دلی کے قائل تھے۔ ان کی تحریریں بھی ہمیں یہی پیغام دیتی ہیں۔

ذاکر صاحب کی شخصیت میں ہماری بہترین اخلاقی اور تہذیبی قدریں مجتمع ہو گئی تھیں۔ سیاست ایک ایسا خارزار ہے جہاں سے اپنے دامن کو صحیح و سلامت بچائے جانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ذاکر صاحب اس خارزار سے بھی بڑی سلامت روی سے گزرے۔ یہ ان کے بے داغ سیاسی کردار کا اعتراف ہی تھا کہ وہ گورنری کے عہدے پر متمکن ہوئے، پھر نائب صدر جمہوریہ کی مسند سے ہوتے ہوئے صدر جمہوریۂ ہند کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوئے۔

زیر نظر کتاب جو معتبر ذاکر شناسوں کے مقالات پر مشتمل ہے اور اکادمی کے وائس چیئرمین اور ممتاز دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مرتب کی ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہشت پہلو شخصیت کے تقریباً سبھی اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب کافی مدت سے اشاعت کی منتظر تھی لیکن کچھ اہم مقالے بروقت فراہم نہ ہونے کے سبب اس کی اشاعت

میں تاخیر ہوگئی۔ اب محترم نارنگ صاحب کی خصوصی دلچسپی کے نتیجے میں بہت سے مقالے از سر نو جمع کیے گئے اور یہ کتاب شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ رہی ہے۔

ہم اردو اکادمی کے سرپرست اور صدر نشیں عالی جناب صاحب سنگھ وزیرِ اعلیٰ دہلی کی عنایات اور توجہات کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں اس کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی ہم اکادمی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی کے اراکین کے بھی شکر گزار ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ زیر نظر کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

مخمور سعیدی

سکریٹری اردو اکادمی، دہلی

مالک رام

ذاکر صاحب

جب ہم کسی بزرگ کی صفات بیان کرتے ہیں، یا اس کی تعریف کرتے ہیں، تو بیشک ہمارا مقصد اس سے مرحوم کی خدمت میں اپنا خراجِ عقیدت پیش کرنا ہوتا ہے لیکن اگر اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ ہماری اپنی اس مخفی خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ کاش ہم بھی وہی کارنامے سرانجام کریں، جو اس بزرگ نے کیے تھے؛ وہی شہرت حاصل کریں، جو اُسے حاصل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے جن اسباب و وسائل کی ضرورت ہے، وہ ہر ایک کو میسّر نہیں آسکتے۔ اس لیے بیشتر یہ خواہش بس خواہش ہی بن کے رہ جاتی ہے، اور ہم عقیدت مندی کے اظہار سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔

ہر ایک شخص خلاصہ یا نتیجہ ہوتا ہے، متعدّد اسباب و علل کا، اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ ایک مغربی مصنّف نے لکھا ہے کہ کسی شخص کے کردار کی تشکیل اس کے والدین کے بچپن میں ہوتی ہے۔ اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا کردار اس تعلیم و تربیت اور ماحول پر منحصر ہے، جو اسے اپنے والدین کی طرف سے ملتی ہے۔ اور والدین کا کردار، اور ان کی صلاحیتیں، ان کے بچپن میں بنتی ہیں۔

آج ہم ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی ان مختلف حیثیتوں سے تعریف کرتے ہیں۔ (انھیں ان کے سب چاہنے والے ذاکر صاحب کہتے تھے، اور میں بھی اس مضمون میں انھیں کا تتبّع کروں گا) وہ ماہرِ تعلیم تھے، وہ عالم تھے، بلند پایہ منتظم تھے، سیاست داں

تھے؛ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا ہر ایک مدّاح اور عقیدتمند ان متعدد میدانوں میں تو کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

مرحوم ایک متموّل خاندان میں پیدا ہوئے، اتنا متموّل کہ جب ان کے والد فدا حسین خاں مرحوم کا انتقال ہوا، تو وہ اپنے پیچھے اتنا اثاثہ چھوڑ گئے کہ ان کے تین تین بیٹوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی۔

ان کا خاندانی ماحول دینی اور اخلاقی تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ انھیں کم سنی ہی میں ایک صوفی بزرگ پیر حسن شاہ کی بیعتِ طریقت کی توفیق عطا ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے دسویں تک تعلیم اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں پائی۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب سیّد الطاف حسین مرحوم تھے۔ یہ بزرگوار بیحد نیک اور دردمند طبیعت کے مالک تھے۔ ذاکر صاحب مرحوم ہمیشہ ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ جب کبھی ان کا ذکر آیا، میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اور ان کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔

ذاکر صاحب بہت مذہبی آدمی تھے۔ ان کی بے ریائیکی اور بے ساختہ ہمدردیِ خلق کا منبع اسی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جوانی میں انھیں کن لوگوں کی صحبت میسر آئی! حکیم اجمل خاں، مولانا محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری — غرض ایسے دسیوں نام ہیں۔ لازماً ان سب باتوں کا ان پر اثر ہوا۔ اور اسی سے ڈاکٹر ذاکر حسین بنے۔

ان کی طبیعت میں غیر ملکی تسلّط کی مخالفت اور انگریز دشمنی شروع سے تھی۔ عین ممکن ہے کہ یہ غیر شعوری اثر ہو، حیدر آباد (دکن) میں انگریز ریذیڈنٹ کی ریشہ دوانیوں اور چیرہ دستیوں کا۔ بہرحال اس کے ثبوت میں صرف ایک واقعے کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

اپریل ۱۹۱۹ء کے جلیانوالہ باغ، امرتسر کے خونیں سانحے کے بعد گاندھی جی نے اپنا مشہور ترکِ موالات کا پروگرام ملک کے سامنے رکھا۔ اس پروگرام کی ایک شق یہ تھی کہ سرکاری اسکولوں کا بائیکاٹ کیا جائے، اور جن اسکولوں اور کالجوں کو سرکاری

امداد ملتی ہے، طلبہ انھیں بھی چھوڑ دیں۔ ان کی جگہ قومی درس گاہیں جاری کی جائیں اور ہمارے بچے ان میں تعلیم حاصل کریں۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ۱۹۲۰ء میں علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ علی گڑھ پہنچے تاکہ طلبہ کو آمادہ کریں کہ وہ ایم۔ اے او کالج کا مقاطعہ کردیں۔ قدرتاً کالج کے ارباب حل وعقد کو تشویش ہونا ہی چاہیئے تھی کہ اگر طالب علم ان اکابر کے کہنے پر کالج سے نکل گئے تو سرسید مرحوم کا لگایا ہوا یہ پودا ٹھٹھر کے رہ جائے گا۔

جو طلبہ ان اکابر ملت کے کہنے پر کالج کا بائیکاٹ کرنے کے حق میں تھے، ان کے سرخیل ذاکر صاحب تھے۔ لیکن یہ خود شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ اپنے دوستوں کو کیا مشورہ دیں۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری کا اقدام تھا چونکہ اس کا طالب علموں کی ایک بڑی تعداد کے مستقبل سے تعلق تھا۔ ذاکر صاحب اس وقت ایم۔ اے کے دوسرے سال کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں کالج کے کرتا دھرتا ڈاکٹر ضیاء الدین تھے (جنھیں بعد کو 'سر' کے خطاب سے نوازا گیا) ذاکر صاحب فرماتے تھے کہ ایک دن انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور فرمایا کہ دیکھو، جذبات کی رَو میں بہہ کر عجلت میں کوئی غلط فیصلہ نہ کر لینا۔ کالج چھوڑنے کا خیال بھی نہ کرو۔ تمہارے آخری امتحان میں بس چند مہینے رہ گئے ہیں، ایم اے ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد تمہارے ڈپٹی کلکٹر نامزد ہو جانے کا میرا ذمہ۔ پھر ساری زندگی عیش وعشرت سے بسر کرو گے۔ نے غم دُزد۔ نے غم کالا۔

ذاکر صاحب فرماتے تھے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کی اس نصیحت نے میری اتنے دن کی ذہنی خلش کا خاتمہ کر دیا۔ میں نے خیال کیا کہ کیا زندگی کا یہی مقصد ہے: میں نے واپس آکر کالج چھوڑنے کا اعلان کر دیا، اور اپنے دوستوں کو بھی یہی مشورہ دیا۔

ان کا یہی فیصلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد کا پیش خیمہ تھا۔ خیر یہ دوسرا قصہ ہے!

پھر اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جس طرح انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت کی اور اس کی ڈانواں ڈول کشتی کو متواتر جان لیوا بھنوروں سے بچا کر کنارے پر لگایا، یہ ہم سب کے سامنے کی بات ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے، جب یہاں

ہندوستان میں بھی مسلمانوں میں اعلا تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں تھی۔ یورپی یونیورسٹیوں میں تربیت یافتہ اشخاص اور مختلف مضامین میں ڈاکٹریٹ کی سند والے تو بہت ہی کم تھے۔ ایسے میں ذاکر صاحب اور عابد صاحب اور مجیب صاحب کا اتنے کم مشاہرے پر اپنی زندگیاں وقف کر دینا معجزے سے کم نہیں۔ ذاکر صاحب کے لیے اس دور میں لے دے کر پچھتّر روپے مشاہرہ مقرر ہوا تھا۔ اور یہ بھی بسا اوقات کئی کئی مہینے نہیں ملتا تھا۔ وہ اس زمانے میں اپنے گھر سے روپیہ منگوا منگوا کر اپنا خرچ چلاتے رہے۔

یہ اتنی بڑی قربانی ہے کہ آج کل کے نوجوان اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ملک و ملت کی خدمت کا اور ایثار کا یہ جذبہ مبنی ہے، ان کی مذہبیت اور تصوّف کے رجحان پر۔

(۲)

میری ان سے پہلی ملاقات، آج سے ۵۰ برس پہلے، ۱۹۳۶-۱۹۳۷ء کے جاڑوں میں ہوئی۔ میں اُسی سال عارضی طور پر حکومتِ ہند میں ملازم ہوا تھا۔ ستمبر میں دفتر شملے سے آئے، تو میں نے ایک سستا سا، دو کمرے کا مکان، قرول باغ میں کرایے پر لے لیا۔ اس زمانے میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے درجے اور اس کے اساتذہ بھی اسی علاقے میں تھے۔ رفتہ رفتہ میرے ان اصحاب سے دید، وادید کے مراسم پیدا ہو گئے۔

ایک دن دفتر سے واپسی کے بعد میں کسی کام سے مکتبۂ جامعہ میں اس کے مینیجر حامد علی خاں مرحوم سے ملنے کے لیے گیا۔ وہاں پہنچا، تو کمرے کے عین درمیان انھیں ایک خوب گورے چٹّے، اکہرے جسم مائل بہ فربہی، اور بھرواں سیاہ داڑھی والے صحتمند جوان صاحب سے باتیں کرتے دیکھا۔ میں ٹھٹھک گیا۔ مجھے کمرے میں داخل ہونے میں تامل تھا کیونکہ ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر میں نے مخل ہونا نامناسب خیال کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کمرہ کوئی ایسا بڑا تھا ہی نہیں کہ ان دونوں کے یوں اس کے

بچوں بیچ کھڑے ہونے سے اس میں اتنی جگہ رہ ہی نہیں گئی تھی کہ ایک اور شخص آرام سے اس میں سماسکتا۔ میں واپس ہونے ہی والا تھا کہ حامد علی خاں مرحوم کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ انھوں نے فوراً کہا، آیئے مالک رام صاحب! آیئے۔ اس پر میں کمرے میں داخل ہو گیا اور حامد علی خان نے میرا تعارف کرایا۔

اس کے بعد میری دو کتابیں مکتبۂ جامعہ نے شائع کیں۔ اوّل "سبد چین"۔ غالب کے فارسی کلام کا مختصر مجموعہ، جو اگرچہ ان کی زندگی کے آخری ایام میں شائع ہوا تھا، لیکن اب نایاب ہو چکا تھا۔ دوسری کتاب "ذکر غالب" غالب کی سوانح عمری تھی۔ میں نے دونوں کا ایک ایک نسخہ ذاکر صاحب کی نذر کیا۔ "ذکر غالب" کا وہ نسخہ آج بھی مکتبۂ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خان صاحب کے پاس ہے۔

اس کے بعد ان سے "محفل غیر میں گاہے، سرِ راہے گاہے" ملاقات ہوتی رہی۔ لیکن بات بالعموم علیک سلیک سے آگے نہیں بڑھی۔ کبھی کبھی خیر و عافیت پوچھ لیتے۔ ایک دن دریافت فرمایا: کہیے، آج کل کیا کر رہے ہیں؟ میں نے دفتری مصروفیتوں کا عذر پیش کر کے کہا کہ کچھ لکھنے پڑھنے کا وقت ملتا ہی نہیں، کوئی خاص کام نہیں کر رہا۔ اس پر کہنے لگے: یہ ماننے کی بات نہیں۔ لکھنے پڑھنے کی لت ایسی ہے کہ جسے ایک دفعہ پڑ جائے، وہ نچلا بیٹھ ہی نہیں سکتا؛ ضرور کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔

میں ۱۹۳۹ء میں ہندوستان سے باہر چلا گیا اور ۱۹۵۴ء میں وطن واپس آیا۔ ان کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوا، اور یوں تجدیدِ ملاقات ہوئی۔ تین برس بعد ۱۹۵۸ء میں مجھے پھر بیرونِ ملک جانا پڑا۔ اسی زمانے میں ان سے خط و کتابت کا آغاز ہوا۔ ان میں سے بیشتر خط میرے مسلسل سفروں میں ضائع ہو گئے۔ شاید تلاش کرنے سے دو چار کہیں میرے کاغذات میں دستیاب ہو جائیں!

میں ۱۹۶۲ء میں اپنے کارِ منصبی کے سلسلے میں بلجیم میں مقیم تھا۔ ایک دن/رات کے وقت میں حسبِ معمول مطالعہ کر رہا تھا۔ اب ٹھیک سا یاد نہیں کہ میرے ہاتھ میں ایڈورڈ براؤن کی خدمت میں پیش کردہ اعزازی کتاب تھی، یا سر ہیملٹن گب کی۔ بہرحال

یکایک مجھے خیال آیا کہ ہم اردو والے کتنے بدتوفیق ہیں کہ ہم نے آج تک کسی مصنف کا اس طریقے پر اعزاز و اکرام نہیں کیا۔ یہ خیال آنا تھا کہ میں نے ہاتھ کی کتاب ایک طرف رکھ دی اور ایک کاغذ لے کر اس پر ان اصحاب کے نام لکھنے لگا، جن کے لیے ایسی کتاب مرتب کر سکتا تھا۔ میرے سامنے دو معیار تھے۔ اوّل، وہ اصحاب جن کا کام وسیع اور قابلِ تعریف اور مفید ہو۔ دوسرے، وہ جو میرے مہربان تھے اور ان سے میرے بے تکلفی کے مراسم تھے اور مجھے یقین تھا کہ کسی دوسرے کو ان کے لیے اس طرح کی کتاب مرتب کرنے کا خیال بھی نہیں آئے گا۔ چنانچہ میں نے یہ چار نام اسی وقت طے کر لیے، اور فیصلہ کیا کہ کتابیں بھی اسی ترتیب سے پیش کی جائیں گی۔

۱۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی (مرحوم)
۲۔ ڈاکٹر سید عابد حسین (مرحوم)
۳۔ کرنل سید بشیر حسین زیدی مدظلہٗ
۴۔ حکیم عبد الحمید (ہمدرد) مدظلہٗ

میں نے ذاکر صاحب کا نام اس فہرست میں نہیں لکھا تھا۔ خیال کیا کہ ان کے صاحبِ علم دوست احباب کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ ان میں سے جب کوئی چاہے ان کی شایانِ شان کتاب مرتب کر سکتا ہے، میرا ان کے بارے میں کوئی اس طرح کی کوشش کرنا چھوٹا منھ اور بڑی بات کے مترادف ہو گا۔ جو نام میں نے تجویز کیے تھے، وہ سب کے سب اتنے منکسر مزاج اور گوشہ نشین قسم کے اصحاب تھے کہ مجھے یقین تھا کہ کسی کا خیال بھی ان کی طرف نہیں جائے گا۔ میں نے ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک کتاب کا نام "نذر" رکھوں گا۔

اگلے ہی دن میں نے اپنے یورپی اور ہندوستانی دوستوں کو خط لکھے اور ان سے مضامین کی درخواست کی۔ بیشتر نے میری درخواست پر لبیک کہا اور مضمون عطا فرمائے۔

میں وسط ۱۹۶۴ء میں وطن واپس آیا، اور ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے اپنے منصوبے کی تفصیلات انھیں بتائیں اور گذارش کی کہ "نذرِ عرشی کمیٹی" کی

صدارت قبول فرمائیں۔ انھوں نے بطیب خاطر میری درخواست منظور کی۔ کتابت اور طباعت کے مراحل کوئی سال بھر میں طے ہوئے اور عرشی صاحب کی خدمت میں کتاب پیش کرنے کی تقریب ۱۹۶۵ء میں خود ذاکر صاحب ہی کی صدارت میں سپروہاؤس میں منعقد ہوئی۔ اور یوں یہ کام بحسن وخوبی سرانجام ہوا۔

اب تو بفضلہ بعض اور اصحاب کی خدمت میں بھی اس طرح کے مجموعے پیش ہو چکے ہیں۔ لیکن نذرِ عرشی، پہلی کتاب تھی جو کسی زندہ اردو ادیب کو اس کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں اس کے احباب کی طرف سے دی گئی۔ فالحمد للہ

واپسی کے بعد میں عارضی طور پر چند سے متھرا روڈ پر ایک کرایے کے مکان میں مقیم رہا۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم بستی نظام الدین (مغربی) میں رہتے تھے۔ ہمارے مسکن کے درمیان میں کوئی چار پانچ منٹ کا فاصلہ تھا۔ وہ ہر روز صبح کے وقت سیر کو جانے اور میرے مسکن کے نیچے سے گذرتے تھے۔ "نذرِ عرشی" کی تقریب کے تین چار ہفتے بعد ایک دن صبح کی سیر سے واپسی پر وہ میرے ہاں تشریف لے آئے۔ میں نے خوش آمدید کہا اور پوچھا کہ آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ مجھ سے کہا ہوتا، میں خود حاضرِ خدمت ہو جاتا۔ کہنے لگے، نہیں، آپ سے ایک درخواست کرنے آیا ہوں۔ میں نے کہا: بسر و چشم۔ فرمایا آپ نے جس طرح کی کتاب عرشی صاحب کے لیے مرتب کی ہے، اسی طرح کی ایک ذاکر صاحب کے لیے بھی مرتب کر دیجیے۔ میرے لیے یہ بےحد عزت و شرف کی بات تھی۔ لیکن مجھے کچھ تعجب ضرور ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ ذاکر صاحب کے چاہنے والوں میں ماشاء اللہ کئی صاحب علم و فضل ایسے بزرگ ہیں، جو یہ کام مجھ سے کہیں بہتر طریقے پر کر سکتے ہیں۔ کہنے لگے، نہیں، یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے دو صاحبوں نے اس کا ارادہ کیا تھا (انھوں نے دونوں کے نام بھی بتائے) لیکن کسی وجہ سے انھوں نے اسے مکمل نہیں کیا۔ آپ اسے ان کی سستی پر محمول کریں یا سلیقے کی کمی پر، بہر حال کام نہیں

ہوسکا۔ "نذرِ عرشی" دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اگر آپ یہ بیڑہ اٹھالیں، تو خدا کے فضل سے یہ کام بوجوہِ احسن مکمل ہو جائے گا۔ بھلا مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں نے ہاں کر لی۔

اگلے ہی دن میں نے ذاکر صاحب کے (جو اُن دنوں نائب صدر جمہوریۂ ہند تھے) کے سکتر بھارگو کو ٹیلیفون کیا کہ میں ذاکر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے وقت لے دیجیے۔ بھارگو سے میری بے تکلفی تھی۔ کہنے لگے: وہ آج کل بہت مصروف ہیں دن بھر لوگ ان سے ملنے کو آ رہے ہیں۔ اس طرح وقت ملنا بہت مشکل ہے۔ آپ یوں کیجیے کہ کسی دن سہ پہر میں آجائیے۔ جب ایک صاحب ملاقات کے بعد جائیں گے، تو میں دوسرے صاحب کے اندر جانے کے وقفے کے دوران میں آپ کو ان سے ملا دوں گا، ورنہ اگر ہم نے ان کی فرصت کا انتظار کیا تو نہ معلوم کتنے دن لگ جائیں۔

میں نے خیال کیا کہ کارِ خیر میں استخارے کی کیا ضرورت ہے! چنانچہ میں اگلے ہی دن ۶۔ مولانا آزاد مارگ پہنچ گیا۔ کوئی صاحب پہلے سے ان کے پاس موجود تھے۔ جو ہی وہ نکلے، بھارگو اندر گئے اور اطلاع کی کہ مالک رام چند منٹ کے لیے ملنے کو آئے ہیں۔ انھوں نے اپنی روایتی ذرّہ نوازی کا مظاہرہ کیا، اور مجھے ملنے کی اجازت مل گئی۔ پوچھا: کہیے، کیسے آنا ہوا؟ میں نے مختصراً عرض کیا کہ آپ "نذرِ عرشی" دیکھ ہی چکے ہیں۔ میرا ارادہ اسی طرح "نذرِ ذاکر" مرتب کرنے کا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ چھوٹتے ہی فرمایا: بھائی، میں جاہل آدمی، کسی اور شخص کا انتخاب کیا ہوتا۔ یہ آپ کو کیا سوجھی! میرے لیے کوئی کتاب مرتب کرنے کا ارادہ ترک کر دیں۔ مجھے شوخی کی (جو دراصل گستاخی تھی) سوجھی۔ میں نے کہا: اسی لیے تو میں نے یہ فیصلہ کیا . س پر قہقہا لگایا۔ لیکن پھر کہا کہ نہیں، میں دراصل اس کا اہل نہیں ہوں۔ میں نے کہا قبلہ! میں آپ سے اجازت لینے کو تو نہیں آیا، وہ تو میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں تو صرف ایک بات میں مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ دوبارہ قہقہا

لگاتے ہوئے بولے: آپ جیتے اور میں ہارا۔ اچھا کہیے، کیا بات ہے؟ میں نے دریافت کیا: صرف یہ کہ آپ کے قریبی دوستوں میں سے کون کون صاحب مضمون لکھ سکتے ہیں، تاکہ میں اُن سے درخواست کرسکوں۔ انھوں نے یورپ کے بعض دوستوں کے نام اور پتے دیے، اور میں ان کا شکریہ ادا کرکے واپس چلا آیا۔

مضامین جمع کرنے اور انھیں سب مراحل سے گذرنے میں دو ڈھائی برس لگ گئے۔ اس دوران میں وہ بفضلہ تعالیٰ صدر جمہوریہ ہو چکے تھے۔ 'نذرِ ذاکر' کی تقدیم کی تقریب ۶ رمئی ۱۹۶۸ کو راشٹر پتی بھون میں منعقد ہوئی تھی، اور اسے ہماری طرف سے پنڈت ہردے ناتھ کنزرو مرحوم نے پیش کیا تھا۔

برسبیل تذکرہ کہہ دوں کہ میں نے اپنے ابتدائی پروگرام کے مطابق ڈاکٹر سید عابد حسین، کرنل سید بشیر حسین زیدی، اور حکیم عبدالحمید صاحبان کے لیے کتابیں مکمل کیں، جو ان کی خدمت میں علی الترتیب ۱۹۷۴ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۱ء میں پیش کی گئیں۔ میں کس زبان سے اور کیسے خدا کا شکر ادا کروں کہ اس نے نہ صرف مجھے اپنا ۱۹۶۲ء کا منصوبہ مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی، بلکہ مجھے بھی اور ان اصحاب کو بھی یہ نذریں وصول کرنے تک اپنی حفظ و امان میں زندہ و سلامت رکھا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

بات سے بات یاد آتی ہے۔ اور مضمون طویل سے طویل تر ہوتا جارہا ہے۔ لہٰذا میں صرف ایک اور واقعے کا ذکر کرکے آپ سے اجازت چاہوں گا۔

جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں، میں ۱۹۶۴ء کے وسط میں یورپ سے واپس آیا تھا۔ غالب کی صد سالہ برسی منانے کے لیے کمیٹی اس سے پہلے بن چکی تھی۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ مجھے اس کی عاملہ (ایگزیکٹو) کا رکن نامزد کر دیا۔ وہ خود کمیٹی کے صدر تھے۔ محی الدین احمد حیدرآبادی، وزیر لیبر سکتر اور کرنیل سید بشیر حسین زیدی خازن تھے۔ عاملہ میں قبلہ فخر الدین علی احمد، ڈاکٹر سید عابد حسین، ہمایوں کبیر، بیگم بھوپال (سابق بیگم پٹودی) اور بعض اور حضرات تھے۔

غالباً ۱۹۶۵ء ہی میں محی الدین احمد کسی کام سے حیدرآباد گئے۔ وہاں بیمار پڑے اور چٹ پٹ ہو گئے۔ جناب فخر الدین علی احمد مرحوم ا مرکزی کابینہ کے رُکن تھے ہی، ذاکر صاحب نے مرحوم کی جگہ انھیں سکتر بنا دیا۔

غالب صدی کی تقریبات منانے کا خیال سب سے پہلے خود ذاکر صاحب ہی کے ذہن میں آیا تھا، جب وہ بہار کے گورنر تھے۔ انھیں دنوں میں کرنل سید بشیر حسین زیدی کی صاحبزادی شمع زیدی نے انھیں ان تقریبات کا پورا پروگرام بنا کر پیش کیا۔ تقریبات کے مختلف حصّے تھے: غالب کی تصنیفات کی اشاعت اور نمایش اور فلم اور بین الاقوامی سمینار اس کے اہم اجزا تھے ــــ اشاعت کا کام قاضی عبدالودود (مرحوم) اور میرے سپرد ہوا تھا۔ نمایش اور فلم کی تیاری کا کام شمع زیدی نے اپنے ذمے لیا۔ نمایش کے لیے نام تجویز ہوا تھا: "غالب اور اس کا عہد" طے پایا کہ غالب کے زمانے میں دلّی کا جو نقشہ اور تمدن تھا، اس کی عکّاسی کی جائے۔ نیز اپنی زندگی میں انھوں نے جو سفر کیے اور جہاں جہاں وہ گئے، یا جن مقامات سے ان کا تعلق رہا، وہاں کی بھی تصاویر جمع کی جائیں۔ اس کے لیے شمع نے بہت محنت کی، ایک ماہر فوٹو گرافر (کرشن آنند) کے ساتھ کلکتے اور حیدرآباد تک کا سفر کیا۔ وہ راستے میں بنارس اور اور پٹنہ بھی رُکیں، اور وہاں کی تصاویر بھی تیار کی گئیں۔ اس طرح مہینوں کی تگ و دَو کے بعد نمایش کے لیے کوئی آٹھ سو تصویریں جمع ہوئیں۔ ان میں سے صرف چار سو سے کچھ زیادہ نمایش میں رکھی گئی تھیں۔ نمایش میں غالب کے بعض اصلی خطوں کے عکس بھی دکھائے گئے تھے۔ ان کی تصانیف کے ان کی زندگی کے شائع شدہ نسخے بھی شاملِ نمایش کیے گئے تھے؛ یہ میں نے اپنے ذخیرے سے مہیا کیے تھے (افسوس کہ ان میں سے دو تین کتابیں چوری بھی ہو گئیں)۔

افسوس کہ غالب کی جملہ تصانیف کی اشاعت پروگرام کے مطابق نہ ہو سکی۔ صرف تین کتابیں شائع ہوئیں: قاضی صاحب مرحوم نے "قاطع برہان" اور اس کے

متعلقہ رسائل شائع کیے۔ اور میں نے اردو دیوان اور "دستنبو" تیار کیں۔

ایوانِ غالب کی عمارت جس قطعۂ زمین پر کھڑی ہے، یہ دلی ایڈمنسٹریشن سے برائے نام داموں پر حاصل کی گئی تھی۔ اس وقت آدتیہ نراین جھا مرحوم یہاں کے گورنر تھے۔ وہ ذاکر صاحب کے دلی دوست اور بڑے دلیر آدمی تھے۔ بعض اصحاب کی مخالفت کے باوجود انھوں نے ذاکر صاحب کے کہنے پر یہ زمین یادگار کمیٹی کو دے دی۔ اور غالباً عمارت کی تعمیر کے لیے بھی آٹھ نو لاکھ روپے کی گرانٹ دی۔ حکومت ہند نے بھی بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا اور لاکھوں کا عطیہ منظور کیا۔ فخر الدین علی احمد مرحوم خود کابینہ کے اہم رکن تھے؛ غالباً صنعت کا محکمہ ان کی تحویل میں تھا۔ وزیر مالیہ بھی ان کے ہمکار اور دوست۔ لہٰذا حکومت کے عطیے اور صنعتکاروں سے چندے کے حصول میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوئی۔

افسوس کہ خود ذاکر صاحب مئی ۱۹۶۹ کے اوایل میں اللہ کو پیارے ہوگئے اور انھیں غالب انسٹی ٹیوٹ کو پھلتے پھولتے دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن یقیناً ان کی روح مطمئن ہوگی کہ انھوں نے جو پودا لگایا تھا اور جس اسکیم کی داغ بیل انھوں نے ڈالی تھی، وہ ان کے جانشینوں کی محنت اور خلوص اور لگن کی بدولت بارآور ہوئی: اور آج یہ ادارہ صرف دلی ہی میں نہیں، بلکہ پورے ملک میں علم و عمل کا اہم مرکز بنا ہوا ہے۔

غالب اور ذاکر صاحب میں پوری ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے، اور ذاکر صاحب ۱۸۹۷ء میں۔ غالب کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی، اور ذاکر صاحب ۱۹۶۹ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ دونوں علم و فضل کی جس بلندی پر تھے وہ سب کو معلوم ہے۔ دونوں نے اپنے عہد کو جس حد تک متاثر کیا، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اور آئندہ نسلوں کی پیش رفت اور ارتقا کے لیے جو سامان انھوں نے ترکے میں چھوڑا، وہ ہمارے سامنے ہے۔ خدا ان دونوں پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ آمین۔ میں ان دو شعروں پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں جو ذاکر صاحب کو بہت پسند تھے۔ پہلا غالب کا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا

میں نے جب بھی یہ شعر انھیں پڑھتے سنا (اور وہ اسے اکثر گنگنایا کرتے تھے) کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کی آواز بھرّا نہ گئی ہو۔

دوسرا شعر مثنوی مولانا روم کا ہے:

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

یہ شعر گویا ان کا موٹو تھا۔ ان کی زندگی اسی کی عملی تفسیر تھی۔ میں اس کی تشریح و توضیح نہیں کر سکتا۔ بلا مبالغہ لکھنے بیٹھوں، تو اس پر ایک چھوٹی موٹی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم۔ حال آں کہ اب بھی جو کچھ کہنا چاہتا تھا، یا کہہ سکتا تھا، اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کہہ سکا۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

کرنل بشیر حسین زیدی

ذاکر صاحب

شکسپیر نے جولیس سیزر کے متعلق مارک انتھونی کی زبانی کہا ہے:

His Life WasGENTLEand the ELEMENTS so mined in him that natureNIGHTStand up
And Say to all the world
"There was a man"

"اس کی زندگی سراسر شرافت تھی اور اس میں عناصر کی ترتیب اس طرح ہوئی تھی کہ خود فطرت پکار اٹھے۔ دیکھو یہ تھا انسان"

یہی بات ذاکر صاحب کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ بہت سی اعلیٰ صفات ان کی ذات میں اس طرح رچ بس گئی تھیں جیسے دھنک میں سات رنگوں کا میل۔ وہ وطن کی آبرو تھے۔ بلند پایہ دانشور، مفکر، ماہر تعلیم، خلق اور تہذیب کا پیکر، انسان دوست، وسیع النظر، سیاست داں اور زندگی کے ہر شعبے میں اتحاد و اتفاق کے علمبردار۔ ان کا ذہن سیکولر تھا اور ان کا صدر جمہوریہ بننا سیکولرازم کی جیت۔ ان کی شخصیت دل کشی اور دل نوازی کے ساتھ جلال و جمال کا مرکب تھی۔ عالمانہ شان کے ساتھ ان میں دانش وری اور عملی سوجھ بوجھ کی آمیزش تھی۔ ان کی سادگی سادہ لوحی نہ تھی۔ وہ اپنے اعتقادات میں راسخ اور تذبذب اور اشکال سے پاک تھے۔ علم و فضل کے ساتھ ان کی حالات پر گہری نظر رہتی تھی مگر وہ ان سے متاثر نہ ہوتے تھے۔ ان میں دانش وری کے ساتھ بصیرت اور عمل کی آرزومندی تھی۔

ان کی آنکھیں فطرت کی دلربائی اور چمن حسن کی دلفریبی سے بھی ناآشنا نہ تھیں۔
چلاپتی راؤ نے انھیں ہندوستان کے Renaissance کا پرنس لکھا تھا۔
انھوں نے ہندوستان کی تہذیب اور کلچر کے ہر پہلو سے کسبِ فیض کیا تھا۔ اور وہ ہمارے مشترکہ کلچر کی علامت تھے۔ ان کی شخصیت میں کچھ گاندھی جی کے اثرات اور کچھ پنڈت نہرو کی فکر وروش کے نشان ملتے تھے۔ اور اس امتزاج نے ان کے فکر وعمل کو متاثر کیا تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کی رہنمائی میں آزادی کی تحریک میں حصّہ لیا اور ابتدائی دور کے مجاہدینِ آزادی میں تھے۔ جامعہ ملّیہ کا قیام قومی تحریک کا تعلیمی محاذ تھا۔ جرمنی سے واپس آکر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جامعہ ملّیہ کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ کچھ دن کے لیے تو بہت سے کسی اعلا مقصد کی خاطر قربانی برداشت کرلیں گے لیکن ان جیالوں نے اپنی جوانی اور زندگی کا بہترین حصّہ نامساعد حالات اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جامعہ کی خدمت میں نثار کر دیا۔ سیاست سے ان لوگوں کا تعلق رہا لیکن ان کی سیاست بلند مقاصد اور پائیدار مفادِ قومی کے لیے تھی۔ ملک کی ترقّی کے لیے ان کے نزدیک صحیح قسم کی تعلیم وتربیت ہی بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔ ایک دفعہ ذاکر صاحب نے فرمایا:

"سیاست، خصوصًا ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے جو آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اُتر جاتا ہے۔ تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا میدانی دریا ہے، سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ تعلیم کا منصوبہ اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچتی نہیں تعلیم راہ کا رُخ متعین کرتی ہے۔"

ایک دوسرے موقع پر انھوں نے کہا تھا:

"مسلمان ہندوستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس سے ان کی حیثیت بالکل مٹ جائے۔

ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی۔ ہندوستان میں ان کا دین ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔"

اُن کا یہ قول ہندوستان اور مسلمان دونوں کے لیے یاد رکھنا مفید اور بہت مفید ہوگا۔

ہم نے اس سال ڈاکٹر حسین جشن منا کر یہ ثابت کر دیا کہ ہم اپنے مشاہیر اور اور محسنوں کو یاد رکھتے ہیں، اور انھیں اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ مگر یاد رکھنا کافی نہیں۔ ہم میں ان کی زندگی اور کارناموں سے سبق لینے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔

وہ دردمندی، انسانیت، فراخ دلی، امن پسندی اور بے غرض خدمت کا مجسمہ تھے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر صحیح شعور کے ساتھ اپنے لیے راہ کا تعین اور نصب العین طے کرنا چاہیے۔ ذاتی ترقی اور کامیابی کے ساتھ ہمیں اپنی شخصیت کے لیے کسی قدرِ اعلا کا خدمت گذار بننا ہوگا۔ ذاکر صاحب کے الفاظ میں "ہم اپنی ساری قوت اس وقت تک صرف نہیں کر سکتے جب تک ہمیں یہ احساس نہ ہو کہ ہمارا منصوبہ عالمِ انسانیت کے لیے ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے۔"

میری دعا ہے کہ ایک بہتر سماج کی تعمیر کی خدمت گذاری میں ذاکر صاحب کے سوز، ان کی تڑپ، ان کے عزمِ محکم، ان کے خواب، اور ان کی خلش کا کچھ حصہ ہمیں بھی مل جائے۔

خورشید عالم خاں

ڈاکٹر ذاکر حسین بہ حیثیت ماہرِ تعلیم
اور ہندوستانی تعلیم کو اُن کی دین

عہدِ حاضر کے ممتاز ماہرینِ تعلیم جو خواب دیکھنے کی ہمت اور حوصلہ رکھتے تھے، اور اپنے مقصد کے حصول کا عزم، ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۳ر مئی ۱۹۶۷ء کو جب ڈاکٹر ذاکر حسین نے آزاد ہندوستان کا سب سے بڑا عہدہ سنبھالا یعنی جب وہ صدرِ جمہوریہ بنائے گئے تو اس موقع پر انھوں نے ایک نہایت موثر تقریر کی۔ اس قسم کی تقریر وہی شخص کرسکتا ہے جس نے زندگی بھر جی جان سے مادرِ وطن کی خدمت کی ہو، اور جس کو گاندھی جی کے آدرشوں پر ناقابلِ شکست یقین ہو۔ ایسے شخص کو بجا طور پر انسانی اقدار کا ایک شریف النفس محافظ کہا جاسکتا ہے۔

میں ان کی بات دہرا رہا ہوں۔ "یہ کہنے کی جسارت کے لیے میں معذرت خواہ ہوں کہ اس سب سے بڑے عہدے کے لیے میرا انتخاب کرنے کی زیادہ تر وجہ یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے ہم وطنوں کی تعلیم کے ساتھ ایک لمبے عرصے سے وابستہ ہوں میں اس بات کو مانتا ہوں کہ قوم کے اصل مقصود کو پانے کا سب سے اہم ذریعہ تعلیم ہے۔ قوم کی ترقی کے لیے تعلیم کی ترقی ناگزیر ہے۔" ڈاکٹر ذاکر حسین کا عقیدہ تھا کہ قوم کا مقدر کلاس روم میں بنتا ہے۔ اور اس مقدر کو بنانے والا دراصل استاد ہی ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کا نام تاریخ میں عہدِ حاضر کے سب سے زیادہ تخلیقی ماہرِ تعلیم کے طور پر زندہ رہے گا۔

ہندوستانی عوام کو اُن کا سب سے بڑا عطیہ ان کی نیار کی ہوئی تعلیمی اسکیم تھی۔
اُن کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ سیاست کے تنگ راستے قوم کو نئی زندگی نہیں دے سکتے
یہ کام تو صرف تعلیمی ترقی کی کھلی فضا ہی میں ہو سکتا ہے۔ ذاکر صاحب تعلیم کو انسانی
ارتقا کا بنیادی ذریعہ سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک انسانی بہبود اور ترقی کی یہی ایک
کلید تھی۔ اس بحث کا آغاز بھی انھوں نے ہی کیا تھا کہ سائنس اور اخلاق کا امتزاج
ہی اصلی تعلیم ہے۔ اعلیٰ اقدار کی کھوج اور سچائی کی تلاش بھی تعلیم کا مدعا ہونا چاہیے علم
وفضل اور مہارت اُس کا نصب العین ہونا چاہیے۔ تعلیم کو قومی ترقی اور سماجی ترقی
کا ذریعہ بننا چاہیے۔ اسے شخصیت کو مکمل بنانے میں موثر ڈھنگ سے مدد دینی چاہیے
جو تعلیم کا اصل مقصد ہے۔

بنیادی تعلیم کی اسکیم جسے وردھا اسکیم کہا جاتا ہے، ذاکر صاحب کے ذہن
کی اُپج تھی۔ یہ اسکیم انھیں بے حد عزیز تھی۔ بنیادی تعلیم کے اساسی اصولوں پر اُن کا
یقین اٹوٹ تھا جو کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ انھوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اقدار کی
اساس پر بنائے گئے اس نئے طرزِ عمل کے لازمی پہلوؤں کو دفتر شاہی کے غلط رویہ
نے کچھ اس طرح مسخ کر دیا کہ پورے تجربے کا رنگ روپ اُجڑ گیا۔ انھیں اس بات
کا ہمیشہ گہرا رنج رہا کہ اسکیم کو مناسب آزمائش کے بغیر ہی رد کر دیا گیا۔ طرزِ تعلیم کی
خوبیوں میں اضافہ کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہمیشہ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا
کہ تعلیم میں استاد کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔ ایک اچھے اور مثالی استاد کے بارے
میں اُن کا زاویہ نظر کیا تھا۔ میں انھیں کے الفاظ کا حوالہ دیتا ہوں :

"استاد کا کام تعلیم دینا یا حکم چلانا نہیں ہے، اس کا کام تو مدد کرنا اور
خدمت کرنا ہے۔ اُس کا کام بچے کے مزاج کو سمجھنا اور اس کے لیے
اعتقاد، محبت اور احترام کا ڈھانچا بنانا ہے۔" ہندوستانی طرزِ تعلیم

میں چیلنج پیدا کرنے کے لیے اس قبیل کے استادوں پر بھروسا کیا
جاسکتا ہے۔ یہی عمل ہمارے سماج میں اُس تبدیلی کا باعث ہوگا
جس کی ہمیں فوری ضرورت ہے۔"

مثالی تعلیم پر زور دیتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا کہ تعلیمی فلسفہ میں زیادہ زور اس بات پر ہونا چاہیے کہ تعلیم میں اقدار کا رنگ نمایاں ہو۔ اُن کا نظریہ تھا کہ شخصی اور قومی وجود کے بارے میں جو آدرش ہم بچوں کو سکھائیں اُن میں روحانیت کا عنصر چوکھا ہونا چاہیے۔ شجاعت اور نیکی، سچ اور خوبصورتی، انصاف اور مساوی برتاؤ، خدمت اور ایثار کے آدرش ہی وہ لازمی اینٹیں ہیں جن سے ہم کو اپنے مستقبل کے تابناک محل کی تعمیر کرنی ہے۔ گاندھی جی کے فیضان کے زیر اثر ذاکر صاحب نے ایک ایسے ادارے کا خواب دیکھا تھا جو قوم کی خدمت کے لیے مثالی شہری فراہم کرسکے۔ انھوں نے اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کا عزم کیا تھا۔ راستے کا انتخاب کر لینے کے بعد انھوں نے ایک عظیم الشان کام اپنے ذمے لیا اور اپنے خواب کو ایک مثالی ادارے کا پیکر دیا جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ یہ ایک ایسی جیتی جاگتی حقیقت ہے جو تعلیم کے میدان میں ایک بے مثال قومی تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اپنے طے شدہ مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے شکستوں کی پروا نہیں کی، ان گنت مشکلوں کا مقابلہ کیا اور ایسے مسائل سے نبرد آزما ہوئے جن سے پہلے کسی کو سابقہ نہیں پڑا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے اُن بے غرض ساتھیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے جو دکھ سکھ میں اُن کے ساتھ تھے اور جنھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ انسانی ارادے سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ انھیں اپنے نظریات، کام اور مقاصد پر پکا یقین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ موانع اور مشکلات کے باوجود وہ جامعہ کو زندہ رکھ سکے۔

تعلیم کے ساتھ عمر بھر کی وابستگی اور زندگی کے سبھی پہلوؤں میں فضیلت کی تلاش ان کی اہم ترین دین تھے۔ وہ یونیورسٹیوں کی خود مختاری کے بہت بڑے حامی تھے۔ اور محسوس کرتے تھے کہ ابھی تک ہم علمی روایات کے لیے وہ آزادی قائم نہیں کر پائے جو دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جب بہار کے گورنر تھے تو انھوں نے محسوس کیا کہ اس اونچے رُتبے میں تخلیقی کام کی گنجائش بہت کم ہے۔ تاہم ایک مشہور واقعہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ ان کی وابستگی کتنی گہری تھی۔ بہار سرکار نے ایک بل پیش کیا جو اگر اپنی اصل صورت میں پاس ہو جاتا تو صوبے کی یونیورسٹیوں کی خود مختاری پر اس کے بہت بُرے اثرات مرتب ہوتے۔ انھوں نے وزیرِ اعلیٰ سے کہا کہ جب تک اُن کی گورنری کی میعاد پوری نہیں ہو جاتی اس بل کو پیش نہ کریں۔ انھوں نے وزیر اعلیٰ سے یہ بھی کہا کہ اگر بل اپنی موجودہ صورت میں پاس ہو گیا تو انھیں استعفیٰ دینا پڑے گا کیونکہ ان کا ضمیر انھیں اُن اختیارات کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ جو اس بل کی رو سے چانسلر کو دیے جا رہے ہیں۔ بعد ازاں گورنمنٹ کو بل کے مسودے میں ضروری تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

ذاکر صاحب محسوس کرتے تھے کہ مستقبل کا جو نقشہ بنایا گیا ہے، اُسے حقیقت بنانے کی جد و جہد میں تعلیم ہماری بہت مدد کر سکتی ہے۔ اس نئی ڈگر پر چلنے کے لیے جس اخلاقی اور ذہنی قوت کی ضرورت ہے وہ تعلیم ہی مہیا کر سکتی ہے۔ جو پرانی قدریں تحفظ کے قابل ہیں انھیں تعلیم ہی محفوظ رکھ سکتی ہے، اور جو نئی قدریں اس قابل ہیں کہ ہماری زندگی کا حصہ بن سکیں وہ بھی تعلیم ہی کے توسط سے رائج ہو سکتی ہیں۔

ذاکر صاحب نے کوئی بھی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ نہ انھوں نے کبھی امید کا دامن چھوڑا نہ ہار مانی۔ انھیں اپنے آپ پر، اپنے ساتھیوں

پر اپنی محنت اور اپنے کام پر اعتماد تھا اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ اُن میں جوکھم اٹھانے اور مشکلوں کا سامنا کرنے کی بہت ہمت تھی۔ اپنے مقاصد کے حصول کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

ذاکر صاحب کے سماجی فلسفے کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بہت بڑی سماجی تبدیلی کے پرجوش حامی تھے۔ زندگی بھر وہ سماج میں نئی قدروں اور نئے رویوں کی حمایت اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ یہ اُن کا بہت اہم عطیہ تھا۔ ملک کے ہر حصے میں علم اور ثقافت کی برتری اور زندگی کے خوبصورت اور لطیف پہلوؤں میں علم و دانش کی فراوانی اُن کی روح کی پکار تھی۔

گنگا جمنی تہذیب ہمارے ملک کی قابلِ فخر روایت ہے۔ اس کی تخلیقی تکمیل کے لیے ذاکر صاحب زندگی بھر جد و جہد کرتے رہے۔ ہماری تہذیب اپنی رنگا رنگی اور بوقلمونی کے باوصف کثرت میں وحدت کی مظہر ہے۔ ہندوستانی عوام میں تخلیقی سوچ کی حوصلہ افزائی کرنا جو قومی ترقی کی ضامن بن سکے، ذاکر صاحب کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ عوام میں سماجی ذمہ داری کا احساس بیدار کرنا، امید کی رمق پیدا کرنا، اپنے ملک کے مستقبل کے لیے جذبۂ افتخار اور یقین کی بنیاد ڈالنا بھی ذاکر صاحب کا نصب العین تھا۔ وہ اس بات کے لیے بھی ساری زندگی کوشاں رہے کہ ملک کے عوام اپنے ہموطنوں کے ساتھ مل کر باوقار زندگی بسر کریں۔

یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ایک ایسے ہمہ جہت سماج میں جو کئی مذہبوں، زبانوں اور ثقافتوں کا گہوارہ ہو، ملت پروری کے لیے اتحاد اور وحدت کا مشترکہ بندھن ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ماحول میں پھیلی ہوئی پھوٹ اور غیر ہم آہنگی اکثر ذاکر صاحب کو نراش اور اداس کر دیتی تھی اور ملک اور قوم کا مستقبل ان کے لیے گہری بے چینی اور اضطراب کا باعث بن جاتا تھا۔

ان کا عقیدہ تھا کہ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمیں فرقہ واریت عدم اتحاد اور نفاق جیسی منفی قوتوں کا نہ صرف مقابلہ کرنا ہے بلکہ اُن پر قابو پانا ہے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے ارادے مضبوط ہوں اور ماضی میں کی گئی غلطیوں سے ہم سبق سیکھیں۔ ان کے الفاظ ہیں :

" فقط اونچا معیارِ زندگی نہ تو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لا سکتا ہے اور نہ اتحاد کو بنائے رکھنے میں مدد کر سکتا ہے۔ لیکن اپنے تئیں سچائی کا اونچا معیار، دوسروں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ، اور مردوں اور عورتوں کے درمیان برابری کا احساس یقیناً یہ کام کر سکتا ہے۔ تب ہم خدا کے حضور میں کھڑے ہو سکیں گے۔ ہمارا ضمیر انکسار اور مضبوط قوتِ ارادی کا امتزاج ہوگا اور ہماری زندگی اور اعمال اُس تکمیل کے مظہر ہوں گے جسے پانے کے لیے ہمارے اندر مسلسل جدوجہد جاری ہے "

ذاکر صاحب مذہبی آدمی تھے۔ وہ سیکولرازم کے پکّے معتقد تھے۔ تمام مذہبوں کی طرف اُن کا رویّہ احترام کا تھا۔ ان کا راسخ عقیدہ تھا کہ سرکار سب شہریوں کو برابر سمجھے اور ان میں مذہب اور ذات پات کی بنا پر کوئی تفریق نہ کرے۔

ذاکر صاحب کو یقین تھا کہ سیکولرازم ہی سچّائی کا ادراک ہے، اور ہر مذہب نے اپنے اپنے طور پر محبت رواداری، ہمدردی اور خیر اندیشی کی تلقین کی ہے۔

ذاکر صاحب قومی اور جذباتی ہم آہنگی کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ ایک ہم آہنگ سماج اُن کا دائمی ایمان تھا۔

آخر میں یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ذاکر صاحب کے نزدیک تعلیم بنیادی

مقصدِ حیات تھا۔ وہ پورے خلوص کے ساتھ اس بات کو مانتے تھے کہ جہالت سے بڑی کوئی غربت نہیں اور علم سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ اُن کے ذہن میں انسان کے اُس مقدر کا خواب تھا جو عقل کی دولت اور روح کی فضیلت کی بنا پر افضل قرار پاتا ہے۔

مرحوم شری جے پرکاش نارائن نے ذاکر صاحب کے بارے میں جو فرمایا تھا، اس کے ایک حوالے پر میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ "ایک ایسی زندگی جو اتنی فعال اور تخلیقی تھی، اتنی ارفع اور اعلیٰ تھی، اتنی نڈر اور قوم کی قدرشناسی سے سرشار تھی، سوائے نور اور انبساط کے سرچشمے کے اور کیا ہو سکتی ہے؟"

(ترجمہ : کیول سوری)

پروفیسر مسعود حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت

کسی بھی تصویر پر تنقیدی نظر ڈالنے کے لیے ایک مخصوص فاصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دقت اس وقت اور زیادہ ہو جاتی ہے جب ناقد یا ناظر خود اس تصویر کا ایک جزو ہو۔ راقم اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے درمیان کچھ اسی قسم کا تعلق ہے۔ لیکن بعض اوقات مقالے کا عنوان تجویز کرنے والے ذہنی کشاکش کے اس تماشے سے لذت حاصل کرتے ہیں جو ایک باپ اور بیٹے یا چچا اور بھتیجے کے درمیان ہو سکتی ہے۔ میں بھی اس وقت اسی کا شکار ہوں۔

بہر حال اس مقالے میں میری کوشش یہی ہوگی کہ اپنی سمجھ کے مطابق ڈاکٹر ذاکر حسین کی پُرپیچ شخصیت کا معروضی جائزہ پیش کر سکوں۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں موضوعیت کا عنصر قطعی طور پر مفقود ہوگا، اس لیے کہ یہ جائزہ مسعود ہوگا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعلق قائم گنج کے آفریدی پٹھانوں کے ایک خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ "حسین خاں" محمد شاہ کے عہد میں آزاد قبائلی علاقے تیراہ سے ترکِ وطن کرکے تلاشِ معاش میں گنگا کی ہری بھری وادی میں دیگر آفریدی خاندانوں کے ساتھ "خیل در خیل" آکر قصبۂ قائم گنج کے ارد گرد بس گئے تھے: کلاں خیل، ککی خیل، شکل خیل، حسن خیل، موالخیل ــــ مد آخون (بڑے استاد) حسین خاں کا تعلق موالخیل سے تھا۔ وہ پٹھانوں کے مولوی بھی تھے، مدرس بھی اور صوفی بھی۔ غالباً یہ انھیں کی شخصیت کا فیضان ہے کہ تین نسلیں سپہ گری میں

گزرنے کے بعد ان کے اہلِ خاندان صاحبِ قلم رہے اور تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس خاندان میں عملی صوفی تو نہیں گزرے ہیں لیکن صوفیانہ اندازِ نظر اور طرزِ حیات کی جانب رغبت عام رہی ہے۔ ذاکر صاحب نے ان خصوصیات سے بہرۂ وافر پایا تھا۔ انھوں نے عمر کا بیشتر حصہ ایک شانِ قلندری سے گزارا۔ ہر چند وہ اپنی "خانیت" پر نازاں نہیں رہے (اور اسی لیے 'خان' کے لفظ کو اپنے نام کا جزو نہیں بننے دیا) تاہم بقول ایرانیوں کے اس "کندۂ ناتراش" یعنی پٹھان میں استقامت اور صلابت کے تمام نشان پائے جاتے ہیں۔ اقبال نے بھی اسے اپنے طور پر محسوس کیا تھا:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا مردِ کہستانی یا بندۂ صحرائی

اس مردِ کہستانی پر قلعی چڑھی حیدرآباد کے تہذیب و تکلفات کے ماحول میں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کے والد فدا حسین خاں مرحوم نے خود کو ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے قلمروئے آصفیہ میں مستحکم کر لیا تھا، وہاں مکان بنوایا اور آصفی دربار کے آداب و تکلفات رہائش، شیروانی دستار اور کیلوس کو اپنی شخصیت کا ایک حصہ بنا لیا۔ ذاکر صاحب اسی حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور ماماؤں اور اناؤں کی دیکھ بھال میں ان کی پرورش ناز و نعم کے ساتھ ہوئی۔ اس عرصے میں قائم گنج کے فطری مگر کھردرے ماحول سے وہ بالکل بے خبر رہے۔ زندگی کا یہ ڈھرّا تقریباً دس سال تک چلتا رہا کہ اچانک ان کے والد کا شہرت اور دولت کی معراج پر پہنچنے کے بعد چالیس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ والدہ نے سات بچوں کے ساتھ وطنِ مالوف کی جانب مراجعت کی اور اس پختہ حویلی میں آکر ڈیرا ڈالا جو فدا حسین خاں نے حیدرآباد کے مکان کے ساتھ ساتھ قائم گنج میں بنوالی تھی۔ قائم گنج کے ماحول سے بچانے کے لیے اسکول کی عمر کے بچوں کو جلد جلد اٹاوہ مسلم ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا، جہاں سے ذاکر صاحب فارغ ہونے کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ چلے گئے۔

اس طرح کم و بیش ذاکر صاحب قائم گنج کے اس ماحول سے بچے رہے جس سے

بعد کو سابقہ ان کے دو چھوٹے بھائیوں ڈاکٹر یوسف حسین اور ڈاکٹر محمود حسین کو پڑا ــــ
دونوں کا مزاج ڈاکٹر ذاکر حسین کے مزاج سے مختلف تھا۔ بقول عبدالمجید خواجہ مرحوم کے،
"یوسف اصلی پٹھان ہے، ذاکر سیاسی آدمی ہیں"۔ بچپن میں ذاکر صاحب کی ان کے
چھوٹے بھائی زاہد حسین (جن کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا) ٹھکائی کر دیا کرتے تھے۔
یوسف صاحب نے اپنی سوانح "یادوں کی دنیا" میں لکھا ہے کہ ذاکر میاں کے "عدم تشدد"
کی بنیاد اسی وقت سے پڑ گئی تھی۔

حالات جو بھی ہوں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ذاکر صاحب کی اخلاقی صفات میں
سب سے نمایاں خصوصیت ان کا تحمل اور قوتِ برداشت تھی۔ اسی لیے وہ کسی کی
دل آزاری کرنے سے گریز کرتے، اور اس کے حصے کی ساری سختی خود اٹھا لیتے تھے۔
وہ ہر زماں اپنے عمل کا حساب کرتے رہتے۔ ان کی شخصیت کی ان خصوصیات کی
شہادتیں ہمیں طالبِ علمی کے زمانے سے ملتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ پہنچتے
ہی وہ وہاں کے ممتاز ترین طالب علموں میں شمار کیے جانے لگے۔ کسی کے پیرو، کسی کے
مرشد، ہر حال میں یکتا و تنہا، سارے زمانے کو ساتھ لے کر چلنے والے، غرض کہ ان
تمام آثار اور نشانیوں کے حامل جو آئندہ کے قائد کی خبر دیتی ہے :

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

علی گڑھ کے قیام میں مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال ان کے لیے وظیفے کا حکم
رکھتا تھا، علی برادران کا جذبۂ حب الوطنی ان کے قلب و جگر کو گرماتا، اور پھر جب
سیاستِ ہند کے افق پر گاندھی جی آندھی بن کر آئے تو قوم پرست مسلمانوں کے
ساتھ ذاکر صاحب بھی ان کے ساتھ چل نکلے۔ لیکن میرِ کارواں بننے کے لیے ابھی ان
کی تربیت کے کئی سال باقی تھے اس لیے تین سال کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی
غرض سے جرمنی چلے گئے جہاں سے ۱۹۲۶ء میں واپس آ کر جامعہ ملیہ کی باگ ڈور سنبھالی
جس کی رہبری ان سے قبل مولانا محمد علی اور عبدالمجید خواجہ کر چکے تھے۔

جامعہ ملّیہ ذاکر صاحب کی شخصیت کی صحیح معنوں میں تربیت گاہ تھی۔ جامعہ بنتی
گئی، اس کے ساتھ ذاکر صاحب بھی بنتے گئے۔ وہ اب ایک ایسے قافلے کے سالار
تھے جو بغیر سروسامان کے ایک موہوم منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ جامعہ نے
انقلاب کے بطن سے جنم لیا تھا۔ اس کے ساتھیوں کو یکجا رکھنے کے لیے ہر لحظہ
انقلاب کے خون کی ضرورت تھی۔ میر کارواں کو یہ خون سب سے زیادہ فراہم کرنا پڑتا۔
مزاح وطنز نگار رشید احمد صدیقی نے اس کے معمک پہلو کو اس طرح بیان کیا ہے کہ:

"جب بھی میں جامعہ ملّیہ جاتا ہوں جس قدر اس کے شیخ الجامعہ سے ڈرتا
ہوں اسی قدر ان کے چپراسی سے ڈر لگتا ہے، اس لیے کہ دونوں خادم
ملّت ہیں!"

ذاکر صاحب کو جہاں اس زمانے میں جامعہ ملّیہ سے زور آزمائی نے توانا و زندہ
رکھا، فکر و شعرِ اقبال نے "ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم" کا سبق پڑھا کر ان کے اندرون
کو پختہ رکھا۔

اس زمانے کے مسلم دانشوروں کے ذہن پر اقبال کی گرفت کس قدر مضبوط
رہی ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جامعہ ملّیہ کے پہلے شیخ الجامعہ
مولانا محمد علی 'اسرارِ خودی' کا ایک نسخہ بغل میں لے کر چلتے تھے اور برسوں تک
جامعہ ملّیہ کے ابتدائی زمانے میں اس کا درس دیتے رہے۔ لیکن مولانا محمد علی
اقبال سے 'تم' سے بات کرتے تھے اس لیے ان کی عقیدت ان کی شخصیت سے
زیادہ ان کی فکر سے تھی۔ ذاکر صاحب اس کے برعکس فنافی الاقبال تھے۔ کئی لحاظ
سے وہ فکرِ اقبال کا عملی نمونہ پیش کرتے تھے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا (ممکن ہے
بعض حضرات اس سے اختلاف فرمائیں) کہ ذاکر صاحب کا اسلام اقبال کا اسلام
تھا۔ یہ نہ تو برخود غلط ملّا کا اسلام تھا اور نہ بے عمل صوفی کا یہ ایک مردِ مومن کا
اسلام تھا، جو اقبال کے لیے تخیلی، ذاکر صاحب کے لیے عملی شکل رکھتا تھا۔ دونوں کا
شبستانِ وجود صبح کی اذان سے لرز جاتا تھا۔ دونوں تلاوتِ کلام پاک سن کر تڑپ

جاتے تھے اور لذتِ سحر گاہی سے سرشار ہو کر دونوں سربسجود ہو جاتے تھے۔ میں نے ذاکر صاحب کو اکثر تنہائی میں اقبال کی "مسجدِ قرطبہ" کے اس بند کو گنگناتے سنا ہے :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

اور خاص طور پر یہ دو شعر جن میں یقیناً وہ اپنے کردار کی جھلک دیکھتے ہوں گے :

اُس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

ان اشعار کو جب وہ گنگناتے تو یقیناً انھیں اپنی "جامعی زندگی" کی جھلک نظر آتی ہو گی، یہ اور بات ہے کہ جب علی گڑھ میں انھیں ایک استقبالیہ میں میری ہی تحریک پر اس بند سے خوش آمدید کہا گیا تو سخت برہم ہوئے اور کہا کہ کاش میں اس لائق ہوتا۔

بات جب اقبال کے "بندۂ مومن" اور مردِ قلندر سے چلی ہے تو اختتام کے طور پر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ ان میں "عقل کی منزل" اور "عشق کا حاصل" دونوں ہمد گر تھے۔ معاشیات کے ایک ماہر کی حیثیت سے امکان تو اس کا تھا کہ وہ "کلیمِ معاش" کے "خطوطِ خم دار کی نمائش، مریز و کجدار کی نمائش" کے چکر میں پھنس جاتے لیکن ان کے مذہبی اور صوفیانہ رجحان نے انھیں "علم و حکمت کی اس مہرہ بازی" سے ہمیشہ دور رکھا۔ ان کا کوئی تحریری بیان تو میرے پیشِ نظر نہیں ہے لیکن گفتگو کے اشاروں سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مارکسی تصوّرات کو تاریخ کا ایک دور سمجھتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر انسانیت دوستی اور آزادیِ فکر پر ایمان رکھتے تھے۔ فرد کی فردیت انھیں عزیز تھی جس کے خود کو پانے کی آماجگاہ انسانی سماج تھا۔ جن رہنماؤں سے وہ مختلف زمانوں میں متاثر رہے ہیں ان کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

اپنے والدِ محترم فدا حسین خاں (جن کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ ذہین اور طبّاع تھے) مولانا ابوالکلام آزاد (جن سے آخر میں ان کا اختلاف ہوگیا تھا جس کا کفارہ انھوں نے اپنی اس تقریر میں دیا ہے جو ان کے انتقال پر دہلی میں کی تھی) مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور سب سے اہم مفکر و شاعر اقبال۔ ایک زمانے میں وہ مولانا الیاس کی تحریک سے بھی متاثر رہے لیکن یہ دور زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔

ذاکر صاحب سخنور نہ بن سکے لیکن اعلا درجے کے سخن فہم ضرور تھے۔ ان کی اندرونی زندگی کی آبیاری شعر سے مکمل طور پر ہو جاتی تھی۔ ان کی نثر اس بات کی غماز ہے کہ اگر تخلیقِ وزن پر اختیار ہوتا تو وہ شعر بھی کہہ سکتے تھے اس لیے کہ فکر و تخیل کی جو غواصی ان کی نثر کے شہ پاروں میں پائی جاتی ہے وہ کسی بھی نظم سے کم نہیں۔ وہ اپنے پسندیدہ شعر ایک بیاض میں لکھ لیا کرتے تھے، اور تنہائیوں میں انھیں اکثر گنگناتے۔ ان کی نثر ڈاکٹر عابد حسین کی نثر کی طرح مربوط اور منطقی نہیں ہوتی لیکن اس میں کی نمود ملتی ہے، گہری بصیرت کے جواہر ریزے پائے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کی روح کی وہ بے تابی ملتی ہے جو سِل کو دل بنا دیتی ہے۔

میں نے ذاکر صاحب کے مذہبی خیالات کے بارے میں کبھی ٹوہ نہیں کی لیکن انھیں بعض ارکانِ اسلامی ادا کرتے ضرور دیکھا۔ وہ پنج وقتہ تو نہیں تھے لیکن فریضۂ سحری کو ادا کرتے وقت ایسے خشوع و خضوع کے عالم میں دیکھا ہے کہ باید و شاید۔ عقل و سائنس کے انکشافات کے قائل ہونے کے باوجود وہ حقیقتِ کلّی کے اس نامعلوم حصّے کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ انسان 'فاتحِ عالم' سہی ابھی بہت کچھ حقیقت کے پردے زیرِ حجاب باقی ہے۔ اس سے لو لگانے کے بہت سے طریقے ہیں، انھوں نے اپنے لیے اسلام کے طریقے کو پسند کیا کہ اس سے واقف بھی تھے اور ربطِ ذہنی بھی رکھتے تھے۔ ان کا دل رقیق تھا لیکن اقبال کی طرح وہ رقّت طاری نہیں کر سکتے تھے۔ اقبال کی کائنات اور اسلام:

ع به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں ہمہ اوست

سے عبارت تھا، ذاکر صاحب کا اسلام عملِ صالح اور خیرِ کثیر پر مشتمل تھا لیکن سیاسی اعتبار سے ان کی اور اقبال کی فکر میں بعد المشرقین تھا۔ ایک "سارے جہاں" تھا اور دوسرا "سارا جہاں ہمارا" والا۔

ذاکر صاحب کی عملی زندگی کا دائرہ علی گڑھ سے رخصت ہونے کے بعد بہت محدود ہوگیا تھا علی گڑھ کی نذر انھوں نے اپنی صحت کی لیکن شہرت بچالے گئے۔ یہاں سے نکل کر پانچ برس تک وہ ریاست بہار کے گورنر، اس کے بعد پانچ سال تک نائب صدر جمہوریہ اور آخر میں دو سال تک صدر جمہوریہ کے اعلا منصب پر فائز رہے۔

ان کے علی گڑھ کے بعد بہار کی گورنری قبول کر لینے پر ان کے دوست اور ہم راز رشید احمد صدیقی کی برہمی دیدنی تھی۔ ان کا شکوہ تھا کہ علی گڑھ چھوڑا تھا تو جامعہ ملّیہ کی جانب بازگشت کی ہوتی۔ رشید صاحب نے اپنے مرشد پر صرف ایک بار تنقیدی قلم بڑے کرب کے عالم میں اٹھایا ہے۔ اکثر حضرات کو اس کی خبر نہیں۔

ذاکر صاحب کے جواز میں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ آزادی ملنے کے بعد تحریکِ آزادی کے سارے بڑے مجاہدوں کا یہ مقدّر تھا کہ وہ تختے سے تخت پر پہنچ جائیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ مولانا آزاد نے صدارت پر وزارت کو ترجیح دی۔ ذاکر صاحب بر بنائے صحت آرائشی عہدوں پر فائز رہے۔ وہ دوبارہ جامعہ جانے کی سکت اپنے میں محسوس نہیں کرتے تھے۔ یو۔جی۔سی کی صدارت پر آمادہ ہوگئے تھے لیکن مولانا آزاد نے اچانک بعض مصالح کے پیشِ نظر شری دلیش مکھ کا اس پر تقرر کر دیا۔ مولانا سے ان کی رنجش کا باعث یہی تھا۔

لیکن انھوں نے ان آرائشی عہدوں کو بھی وہ زینت بخشی کہ بقولِ غالب

ع ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر درودیوار

پروفیسر ثریا حسین

ذاکر صاحب اور علی گڑھ

علی گڑھ کو یہ افتخار حاصل رہا ہے کہ اس درس گاہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد نے قومی زندگی میں پیش رو کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ تعلیم، شعر و ادب، جد و جہدِ آزادی، اسلامیات، سائنس اور آرٹ غرض کہ ہر شعبہ میں جو منتخب ہستیاں مشہور ہوئیں اُن میں ذاکر حسین خاں پیش پیش ہیں۔

عملِ پیہم اور خدمتِ قوم کی لگن اس نامور فرزند کی گھٹّی میں پڑی تھی۔ ان کا وطن شمالی ہند کا قصبہ قایم گنج ضلع فرخ آباد تھا مگر پیدائش حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ جہاں اُن کے والد وکالت کرتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد دس سال کی عمر میں وہ اسلامیہ اسکول اٹاوہ کے بورڈنگ ہاؤس بھیج دیے گئے۔ وہاں سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے ۱۹۱۳ء میں ایف۔ ایس۔ سی کے لیے علی گڑھ آئے اس سے پہلے اُن کے دو بڑے بھائی یہاں داخل ہو چکے تھے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری نہ ہو سکی تو وہ سائنس سے آرٹس کی طرف منتقل ہوئے۔ بی۔ اے میں ان کے مضامین انگریزی ادب، فلسفے اور اقتصادیات تھے۔ اسی زمانہ ۱۸-۱۹۱۷ء میں وہ یونین کے وائس پریزیڈنٹ کے لیے کھڑے ہوئے۔ یہ قصہ رشید احمد صدیقی یوں سناتے ہیں:

" سارے طلباء خواص اور عوام کے نام سے دو گروہوں میں منقسم تھے ہر فریق کے امیدوار کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی قابلیت اور اہمیت

جتانے کے لیے یونین میں تقریر کرے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کو بھی بحث کا عنوان دینا پڑا۔ مخالف جماعت نے مشہور کر دیا کہ ذاکر صاحب کے لیے فلاں پروفیسر نے تقریر لکھ دی اور وہ رٹنے میں مصروف ہیں۔ مباحثہ کا وقت آیا۔ ذاکر صاحب کا نام لیا گیا۔ ہال تالیوں اور سیٹیوں سے گونجا۔ انھوں نے ڈائس پر آکر صرف اتنا کہا کہ میں ادب کے ساتھ موضوعِ بحث کو اس مجلس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں جو کچھ عرض کرنا ہے وہ اپنی جوابی تقریر میں کہوں گا۔ فوراً ہی اُدھم مچ گیا۔ فریق مخالف نے خوب پھبتیاں کہیں۔ حامیوں کا یہ حال کہ کوئی غصّہ میں کوئی مایوس ہو کر کوئی اپنے آپ پر نفریں کرتا ہوا اور کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا مجمع سے جانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جواب کا وقت آیا عالم کچھ ایسا طاری کہ کسی نے تالی تک نہ بجائی۔ اب انھوں نے ہر مخالف کے دلایل کے جواب دینے شروع کیے۔ مجمع سے صدائے تحسین بلند ہوئی۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا شاعر اپنی بہترین نظم سنا رہا ہے جس کے ایک ایک شعر پر مجمع تلے اوپر ہو رہا ہے۔ تقریر ختم ہوئی۔ رائے لی گئی تو سارا ہال موافقت میں کھڑا ہو گیا۔ صدر نے نتیجہ کا اعلان کیا۔ اب ذاکر صاحب کے موافقین کی بن آئی تھی۔[1]"

ذاکر صاحب کالج کے ذہین اور ہردلعزیز طالبِ علم تھے۔ رسالہ علی گڑھ منتھلی میں وہ From the Sleepy Hollow کے عنوان اور رپ (Rip) کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ ادارہ کے شب و روز پر یہ چٹ پٹی تحریریں طلبا ر میں بڑی مقبول تھیں۔ فرضی نام پر کسی طالبِ علم نے اعتراض کیا جواب میں ذاکر صاحب لکھتے ہیں :

---

[1] رشید احمد صدیقی۔ ذاکر صاحب کتابی دنیا لمیٹڈ۔ دہلی ص ۲۵۔ ۲۴

ساتھی۔ سب نے ان کی دیو قامت شخصیت کا کشادہ دلی سے اعتراف کیا ہے۔ اُن کے علمی تجسس، حوصلہ مندی، سوجھ بوجھ اور ایمانداری اور شرافت کی وجہ سے انھیں اپنا مرشد کہا ہے۔

جب وہ علی گڑھ میں تھے کہ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک کا ہنگامہ شروع ہوا اور انگریز دشمنی کی لہر سارے ملک میں پھیل گئی۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور علی برادران نے اراکینِ کالج کو خط لکھے کہ وہ حکومت سے کسی طرح کی امداد قبول نہ کریں۔ منتظمین کو اس مطالبہ کے ماننے میں دشواری معلوم ہوئی تو تحریک سے ہمدردی رکھنے والے طلبار نے یونین کی طرف سے مہاتما گاندھی اور ابوالکلام آزاد وغیرہ کو بولنے کی دعوت دی۔ ان قومی رہنماؤں نے پرجوش تقاریر کیں۔ طلبار دو گروہ میں بٹ گئے۔ ایک گروہ ذاکر صاحب کی سرکردگی میں کالج سے الگ ہو گیا مگر انھوں نے ساتھ ہی یہ مطالبہ کیا کہ اُن کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے، چنانچہ ۱۹۲۰ء کو ایک آزاد قومی مدرسہ کھولا گیا جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر اس کے پہلے سربراہ ہوئے۔ ذاکر صاحب طلبار اور اساتذہ کے درمیان کی کڑی تھے۔ کچھ سال بعد جب جامعہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا اور ذاکر صاحب جرمنی سے ڈاکٹریٹ کر کے واپس آئے تو ۱۹۲۶ء میں انھوں نے شیخ الجامعہ کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس صورت حال کا وہ یوں ذکر کرتے ہیں :

"علی گڑھ کو مَیں اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ یہ ہی میرا گھر تھا۔ یہ ہی میرا وطن تھا، اسی کے بارے میں سوچتا تھا، اسی کے لیے میں اپنی زندگی کا پروگرام بنایا کرتا تھا۔ میں نے اور میرے چند ساتھیوں نے اس ادارے سے بغاوت کی تھی۔ ہم اس ادارے کو جیسا دیکھنا چاہتے تھے ہم اس کا جو اصل مقصد سمجھتے تھے اسے یہاں کے کارکن ماننے کو تیار نہ تھے اس زمانہ میں تحریکِ عدم تعاون چل رہی تھی۔ ہم اس کے حامی تھے۔ ہمیں یہاں سے نکال دیا گیا۔۔ ۔۔۔ اس کے بعد میں نے اور میرے ساتھیوں

نے جامعہ ملیہ کا کام شروع کیا لیکن جامعہ کو علی گڑھ سے علاحدہ کوئی چیز
نہیں سمجھتے تھے۔ میں نے جامعہ کا کام اس لیے جان لگا کر کیا کہ میں اسے
بھی علی گڑھ کا کام سمجھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا
جب ہم علی گڑھ واپس جائیں گے اور اسے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کا
مرکز بنائیں گے۔[1]

ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریات کی ترویج جامعہ ملیہ کے ذریعے ہوئی جس کے لیے انھوں نے بڑے ایثار اور قربانی سے کام کیا۔ ان کا نقطۂ نظر تھا کہ تعلیم محض کتابوں کے پڑھنے اور یاد رکھنے کا نام نہیں بلکہ فرد اور جماعت کے مابین جو اٹوٹ رشتہ ہے اس کی پہچان ہی تعلیم کا نصب العین ہے۔ بتقریب پنجاہ سالہ جوبلی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے خطبۂ صدارت میں مارچ ۱۹۳۷ء کو اسٹریچی ہال میں انھوں نے کہا:

"کتابی تدریس کی جگہ عملی اکتشاف کو دینی ہوگی۔ خالی واقفیت کی جگہ
صحیح ذہنی تربیت اور خالی علم کی جگہ اچھی سیرت کو مرکزِ توجہ بنانا ہوگا
اور اپنے مدرسوں کو قومی زندگی کے ساتھ ربط دینے کی تدبیریں نکالنی
ہوں گی۔"[2]

واردھا اسکیم کے نام سے مہاتما گاندھی نے نئی تعلیم کا نصاب مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی اس کا صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کو بنایا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ میں ہاتھ کے کام کو خاص طور پر اہمیت دی گئی کیونکہ ملک کی بڑی آبادی کا گذر بسر اسی پر تھا۔ غلام السیدین اس کی تفصیل لکھتے ہیں:

---

[1] ذاکر حسین۔ یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ

[2] ذاکر حسین۔ خطبۂ صدارت پنجاہ سالہ جوبلی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔
مقتدیٰ خاں شیروانی علی گڑھ یونیورسٹی پریس ص ۲۲۵

"جب سے اس اسکیم نے جنم لیا، ذاکر صاحب نے مختلف طرح سے بڑے دلکش اور دل نشیں انداز میں اس حقیقت کو سمجھایا کہ انسان کی زندگی میں کام کا کیا مقام ہوتا ہے وہ کام ہے جو دیانت داری، صداقت اور مستعدی اور ذہانت سے کیا جائے۔ بچے اسکول میں جو چیزیں بنائیں وہ ہر لحاظ سے اتنی اچھی ہونی چاہیئں کہ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے جب تک وہ اس طرح کام نہ کریں گے نہ اُن میں شخصیت کی تربیت ممکن ہے اور نہ ان میں صحیح قدروں کی لگن ہوگی[1]"

ذاکر صاحب مختلف اوقات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ، اکیڈمک کاؤنسل شعبۂ اقتصادیات، ایگزیکیٹو کاؤنسل وغیرہ کے ممبر رہے۔ جب بھی یونیورسٹی کو کسی بیرونی ممبر کی ضرورت ہوتی ذاکر صاحب جیسے ہی خواہ کا نام فوراً ذہن میں آتا۔

برصغیر کی تقسیم کی بنا پر ملک پر آشوب حالات سے دوچار تھا۔ اس ہمت شکن زمانے میں ۱۹۴۸ء میں وزیر تعلیم ابوالکلام آزاد کے ایما پر ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی۔ یونیورسٹی کا یہ دور اس کے بانی سر سید کے وقت سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا۔ جب قدم قدم پر دشواریوں، شکست خوردگی اور آپسی اختلافات کے علاوہ مالی مشکلات کا سامنا تھا ــــ اس موجودہ مخدوش صورتِ حال سے قوم کو نکالنے کا کام ذاکر صاحب نے اپنے اوپر لیا۔ انھوں نے بہ حیثیت وائس چانسلر پہلی تقریر میں کہا:

"مجھے دکھائی دیتا ہے کہ ہندوستانی قومی زندگی کی تعمیر میں اس ادارہ کا بہت مقام ہے ــــ مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو میں جامعہ ملیہ کے کام کو چھوڑ کر علی گڑھ نہ آتا ...... مجھے صاف محسوس ہوا کہ یہاں اہم قومی کام کا ایک نادر موقع ہے ..... وہ کام ہندوستانی تدبّر اور ہندوستانی

---

[1] غلام السیدین۔ آندھی میں چراغ۔ مردِ مومن ڈاکٹر ذاکر حسین دہلی ص ۲۸۹

تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصّہ اور مقام ہے[1]

ذاکر صاحب نے پہلے کانوکیشن منعقدہ ۲۱ فروری ۱۹۴۹ء کو طلبار کی تعداد جو آدھی رہ گئی تھی ۱۱۴۳ بتائی اور بجٹ تقریباً سترہ لاکھ رہ گیا تھا۔

ان نقصانات کی تلافی کے لیے وہ نیک نیتی سے اعلیٰ پیمانے پر پلان بنانے اور ان پر عمل درآمد میں مصروف ہو گئے۔ وہ اس لگن سے ان دنوں کام کر رہے تھے کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب ایم اے او کالج بنا تھا اور جب ۱۹۲۰ء میں اُسے یونیورسٹی کا درجہ ملا تو اس کے مختلف سربراہوں نے بھی اسی دل سوزی سے کام کیا ہوگا۔

ذاکر صاحب نے پورے استقلال اور امید کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی کی تعمیرِ نو کا کام شروع کیا۔ عالیشان عمارات اور وسیع وعریض رہائش گاہوں کے نقشے بننے لگے۔ نئے نئے شعبہ جات کھولے گئے۔ ادارۂ علومِ اسلامیہ میں ولیسٹ ایشین اسٹڈیز کا اضافہ ہوا۔ امراضِ چشم کا انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔ میڈیکل کالج کے قیام کے لیے یو جی سی سے منظوری حاصل کی گئی۔ لائبریری سائنس کے کورسیز کی ابتدا ہوئی۔

اُن کی خواہش تھی کہ علی گڑھ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں امتیازِ خاص حاصل ہو۔ ۱۹۵۵ء میں وزیرِ اعظم پنڈت نہرو نے ایک عظیم الشان لائبریری کا سنگِ بنیاد رکھا جو مولانا آزاد لائبریری کے نام سے موسوم ہے، یہ کتب خانہ بالخصوص مشرقی علوم اور اسلام سے متعلق کتب اور مسودات کا نادر ذخیرہ ہے۔ اساتذہ کو وہ ماڈل سمجھتے تھے۔ اُن کی علمی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے اور شعبوں کی توسیع میں فراخدلی سے ہمت افزائی کرتے۔ شعبۂ نفسیات میں تحقیق کی سہولت بہم پہنچائی گئی تا کہ وہ اقلیت کے ذہنی رشتے

---

[1] ذاکر حسین کانوکیشن ایڈریس ۱۹۴۹ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا تجزیہ کر سکیں۔ اسلامک فلاسفی۔ انڈو پرشین لٹریچر اور ہسٹری آف اردو لٹریچر کے بڑے پروجیکٹ منظور ہوئے، اردو شاعروں اور مصنفوں کی اہم تخلیقات کو دیونا گری میں منتقل کرنے کی تجویز ہوئی۔ شعبۂ تاریخ میں تحقیق کا میدانِ خاص ——— Medival India کا تعین کیا گیا۔ سائنس اور انجنیئرنگ کے شعبوں پر خاص توجہ دی گئی۔

ڈاکٹر صاحب طلبا سے ملاقات کے مواقع تلاش کرتے۔ اُن کے مسائل کو غور سے سنتے اور انھیں حل کرنے کی فوری کوشش کرتے۔ وہ ہر ایک کے غم گسار تھے نوجوان طلبا کو سمجھاتے کہ ہم جس ملک، سماج اور تہذیب کا حصہ ہیں اس کی شناخت ضروری ہے۔ ہمیں اپنی زبان و ادب، روایات، اخلاقی اقدار اور قومی یکجہتی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے اور اسے زندگی میں برتنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ بھی اُن کی بات سننے پر مجبور ہوتے۔

ان کی ہمدردی اور بھلائی کا یہ عالم تھا کہ کوئی ضرورت مند طالب علم آتا تو خاموشی سے اس کی مدد کرتے تھے ———

تعلیم نسواں کی ترقی کو وہ قومی خدمت سمجھتے تھے۔ اُن کے دور میں ویمنس کالج کی بڑے پیمانے پر توسیع ہوئی کالج کی موجودہ عریض عمارت تیار ہوئی اور بہت سے ایسے مضامین جواب تک نہیں پڑھائے جاتے تھے اُن کی تدریس شروع ہوئی اسی زمانہ میں طالبات کے چار ہوسٹلز کو ملا کر اس کا نام عبداللہ ہال رکھا گیا تا کہ اُن کو بھی لڑکوں کی طرح رہائش کی تمام سہولتیں میسر آسکیں۔ برقع کا رواج کم ہوا۔

دار العلوم کی رنگا رنگی میں مزید اضافہ بیرونی طلبا کی شمولیت سے ہوا۔ مڈل ایسٹ، افریقہ اور بہت سے ملکوں سے وہ بغرض تعلیم آنے لگے۔
۱۹۵۵ء سے علی گڑھ کے لڑکے لڑکیاں یونیورسٹیوں کے سالانہ یوتھ فیسٹول میں شرکت کرنے لگے جہاں اُن کی ٹولیوں نے مختلف فنونِ لطیفہ کے انعامات حاصل کیے۔

اساتذہ کے علاوہ ہونہار طالب علم بھی سرکاری وظائف پر مغربی ممالک بھیجے گئے۔ متعدد عالم اور دانشور بطور وزیٹنگ پروفیسر مختلف شعبوں میں مدعو ہوتے۔ انھوں نے دانش گاہ کی علمی فضا بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

گلابوں کے شائق ذاکر صاحب کی نظر یونیورسٹی کی چمن بندی پر بھی تھی۔ وکٹوریہ گیٹ کے سامنے پھولوں سے بھرا نہ صرف ایک باغ تیار کیا گیا بلکہ سارا کیمپس گل و گلزار ہو گیا۔ سرسید ہال، دیگر اقامت گاہوں اور شعبوں میں لان اور پھولوں سے لدی رنگین کیاریاں آراستہ کی گئیں۔ باغات کی سرسبزی و شادابی یہاں کے باسیوں کے لیے زندگی و تازگی کی علامت بن گئی۔ اپنی حسنِ جمالیات کی بنا پر وہ علی گڑھ کے جہانگیر کہلائے۔

انھوں نے اپنے آٹھ سالہ دورانِ قیام میں وزارت تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے رابطہ قائم کر کے علی گڑھ کو ایک مستحکم صورت دی۔ کانووکیشن ایڈریس ۵۵-۵۶ء میں وہ طلبا کی تعداد چھ ہزار بتاتے ہیں اور یونیورسٹی بجٹ بڑھ کر تیس لاکھ تین ہزار آٹھ سو بیس ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں ہماری توجہ اس طرف دلائی جو اس دور میں بھی معنی خیز ہے:

"آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے۔ بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے۔ یہ مسئلہ نہ صرف ملک و قوم کے زندہ رہنے کا ہے بلکہ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے۔"

ذاکر صاحب ۱۹۵۶ء کے آخر تک علی گڑھ سے وابستہ رہے۔ علی گڑھ کے بعد وہ ریاست بہار کے گورنر ہوئے پھر نائب صدر اور آخر میں صدر جمہوریہ ہند کے عہدے پر فائز ہوئے ـــــ یونیورسٹی سے چلے جانے کے بعد بھی اور

اپنی نئی اہم ذمہ داریوں اور مصروفیات کے باوجود وہ علی گڑھ کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہے۔

وہ علی گڑھ تحریک کی ایک ایسی دل پذیر شخصیت تھے۔ دوست، متحرک اور رمز شناس۔ اقبال کے مردِ مومن اور کردار کے غازی کی ایک جامع تصویر کہ ہم آج بھی اُن کی یاد سے نئے چراغ روشن کر سکتے ہیں۔ ٭

محمد حسنین سیّد

ڈاکٹر ذاکر حسین اور جامعہ ملیّہ اسلامیہ

شروع اللہ کے نام سے جو ساری کائنات کا اور ہم سب کا پیدا کرنے والا پالنہار مالکِ حقیقی حاکم اور فرماں روا ہے۔ درود و سلام اس کے تمام نیک بندوں پر تمام انبیا کرام پر بالخصوص اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جنھوں نے اللہ کے دینِ اسلام کو آخری طور پر اور مکمّل طور سے ہر طرح کی تکالیف اٹھا کر دنیا کے سارے انسانوں کے لیے رہتی دنیا تک کے لیے قولاً اور عملاً پیش فرمایا۔

اس کے بعد میں شکر گزار ہوں اردو اکیڈمی دلّی کے ذمّہ داروں کا، پروفیسر گوپی چند نارنگ کا جنھوں نے محض استادِ محترم ڈاکٹر ذاکر حسین کا ایک ادنا شاگرد ہونے کے ناطے مجھ جیسے ایک دور افتادہ خستہ از کار رفتہ انسان کو اس موقع پر یاد کر لیا اور استادِ محترم کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرنے کا موقع فراہم کیا ورنہ ان اعلا تعلیم یافتہ حضرات کی مجلس میں میرے لیے لب کشائی کا کوئی موقع نہ تھا۔ میرے مقالے کا عنوان تجویز کیا گیا ہے ڈاکٹر ذاکر حسین اور جامعہ ملیّہ اسلامیہ۔ میرے خیال سے اس عنوان کے تین اجزا ہو سکتے ہیں۔ اوّل ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت دوئم جامعہ کا تصوّر اور مقصد، سوئم اس کے حصول کی کوششوں میں کامیابیاں اور ناکامیاں۔

استادِ محترم ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت

ان کی شخصیت ہر لحاظ سے ممتاز اور معروف و مشہور ہے۔ ذاتی وجاہت بقول حفیظ جالندھری ۔

جمال بھی ہے جلال بھی ہے　　یہ شخصیت کا کمال بھی ہے

مگر ہمیشہ جمال کی حالت ہی میں دیکھا کبھی جلال کی حالت میں نہیں دیکھا۔

علم و فضل کے لحاظ سے علی گڑھ سے بی اے اور جامعہ ملیہ سے ایم۔اے کرنے کے بعد جرمنی سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کیا۔ اپنی مادری زبان اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور جرمنی زبان بھی جانتے تھے۔ دین سے طبعی لگاؤ کی وجہ سے دین کی شعوری واقفیت کے ساتھ قرآن، سیرت اور تصوّف سے گہری دلچسپی تھی۔ صوفیائے کرام کے معتقد اور علامہ اقبال سے حد درجہ متاثر تھے۔ عملاً شروع جوانی سے کبائر سے مجتنب، فرائض اور شعائرِ اسلام کے پابند رہے — حسنِ اخلاق کے نہایت اونچے مقام سے نوازے گئے تھے۔ اپنی علمی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دورِ جدید کے بانی اور پہلے شیخ الجامعہ، آزادی کے بعد علی گڑھ کے وائس چانسلر، بہار کے گورنر، نائب صدر جمہوریہ اور آخر میں صدر جمہوریہ ہند کے منصب پر فائز رہنے کی حالت میں انتقال فرمایا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور فردوس میں جگہ دے۔ سینکڑوں ہزاروں اُن کو بہت قریب سے جاننے والے اور ان کی شخصیت سے کسبِ فیض کرنے والے ہیں۔ سینکڑوں نے ان پر اظہارِ خیال کیا اور لکھا ہے۔

میری ان سے پہلی ملاقات اگست ۱۹۳۴ء میں جامعہ ملیہ میں داخلے کے وقت ہوئی۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۰ء تک میں جامعہ میں رہا۔ اس زمانے میں جامعہ بہت چھوٹی سی تھی۔ اس کی حیثیت ایک کنبہ اور خاندان کی سی تھی۔ اس لیے اس زمانے میں استادِ محترم کو بہت قریب سے دیکھنے سننے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ ہم کو

انھوں نے انگریزی اور معاشیات کے درس دیے۔ میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر عرض کروں گا کہ ان کی سی محترم محبوب اور شفیق شخصیت سے ان کے سوا کسی اور سے میرا واسطہ نہیں پڑا۔ میں ۱۹۳۴ء میں والدِ محترم کی مرضی کے خلاف اور ان کی اجازت کے بغیر تلاشِ علم میں جامعہ پہنچا تھا۔ انھوں نے اپنی آغوشِ شفقت میں پناہ دی۔ پھر اتنا نوازا اور اس قابل کیا کہ جامعہ میں چھ سال رہ کر وہاں سے فراغت کی، میں ان کو اپنا پانچواں محسن سمجھتا ہوں۔ جامعہ میں اس وقت بی۔ اے تک ہی کی تعلیم ہوتی تھی۔ افسوس ہے کہ اپنی نالائقی اور کم ظرفی سے استادِ محترم اور جامعہ سے خاطر خواہ کسبِ فیض نہ کرسکا۔ مگر ان کی شخصیت سے اتنا ضرور متاثر ہوا کہ جامعہ چھوڑنے سے پہلے شعوری طور پر میں نے طے کیا کہ دین و ملّت کی خدمت کروں گا اور تعلیم و تصنیف و تالیف کو ذریعہ بناؤں گا اور کوئی سرکاری ملازمت نہیں کروں گا۔
جب میں بی۔ اے کے امتحان سے فارغ ہوا تو استادِ محترم میرے کمرے میں تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ آئندہ کیا ارادہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جب جامعہ میں تعلیم حاصل کی ہے اور آپ حضرات کا نمونہ سامنے ہے تو جہاں تک ہو سکے گا دین و ملت کی خدمت ہی کروں گا۔ فرمایا یہ تو مبہم سی بات ہے۔ کیا ذریعہ اور طریقہ اختیار کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ دربھنگہ، بہار جا کر کسی تعلیمی ادارہ میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور ساتھ ساتھ اردو میں ایک پرچہ نکالوں گا اور تصنیف و تالیف کا کام کروں گا۔ استادِ محترم نے میرے اس ارادے کو سراہا۔ حالانکہ وہ چاہتے تھے میں بھی اپنی خدمت جامعہ کو پیش کر دوں۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں دربھنگہ پہنچ کر ایک تعلیمی ادارے میں جگہ حاصل کی اور دوسرے ہی سال جب جنگِ عظیم ثانی شباب پر تھی 'ہمالہ' کے نام سے ایک پرچہ اردو میں دینی، علمی اور ادبی نکالنا شروع کیا۔ پھر جب اگست ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی اور اس سے اتفاق ہو تو تیسرے ہی مہینے اکتوبر ۱۹۴۱ء میں اس سے وابستہ ہو گیا۔ پھر اسی کے لیے فارغ اور یکسو ہو گیا اور اب تک اس سے وابستہ ہوں۔ ۱۹۷۹ء کی ابتدا میں گوہاٹی، آسام

سے میں نے دلّی کا ارادہ کیا تو استادِ محترم کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا کہ میں دلّی حاضر ہو رہا ہوں۔ دلّی میں چند دنوں قیام رہے گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں اگر آپ حسبِ موقع وقت مقرر فرما کر درج پتہ پر مطلع فرمائیں تو حاضر ہو سکتا ہوں یہ بھی عرض کیا کہ آسام بھی آپ کی عمل داری میں شامل ہے، آسام والوں کو دلی مرکز سے شکایت ہے کہ وہ آسام پر توجہ نہیں دیتا۔ آسام کو محض جنگل اور آسامیوں کو جنگلی سمجھتا ہے۔ کبھی آپ آسام کا بھی پروگرام بناتے تو بہتر ہوتا۔ چند ہی دنوں میں جواب آگیا کہ آپ دلّی آرہے ہیں اور جن دنوں آپ دلّی میں رہیں گے میں دلّی میں نہیں رہوں گا۔ جنوب کا پہلے سے پروگرام ہے۔ انشاء اللہ آپ سے ملاقات ہوگی۔ کچھ دنوں کے بعد اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ صدر جمہوریہ ہند آسام جانے والے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے سکریٹری اور ملٹری سکریٹری کے خطوط آئے کہ پچیس اپریل ۱۹۶۹ء کو صدر گوہاٹی پہنچ رہے ہیں۔ وہ آپ سے ساڑھے پانچ بجے شام کو ریسٹ ہاؤس میں مل کر خوش ہوں گے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے۔ وقتِ مقررہ پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام و دعا کے بعد پہلا سوال یہ کیا کہ آپ آسام کیسے آگئے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جماعتِ اسلامی میں اس کے نصب العین سے اتفاق کرتے ہوئے اس سے وابستہ ہو گیا تھا اور جس طرح آپ حضرات نے اپنی خدمات جامعہ کو پیش کر دیں میں نے بھی اللہ کی توفیق اور آپ کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے اپنی خدمات ۱۹۴۴ء میں جماعتِ اسلامی کو پیش کر دیں۔ بیس سال تک بہار، اڑیسہ، بنگال اور نیپال میں جماعت کے پیام کو پہنچانے کی کوشش کی۔ جب وہاں کچھ کارکن ہو گئے تو جماعت نے مجھ کو یہاں بھیجنا پسند کیا اور ۱۹۶۲ء سے میں یہاں ہوں۔ فرمایا کہ آپ نے بڑے استقلال سے اپنی خدمات انجام دیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ محض اللہ کی توفیق اور آپ حضرات کی تعلیم و تربیت اور عملی نمونہ کے نتیجہ میں ہوسکا۔ فرمایا اللہ آپ کو کامیاب کرے۔ آپ لوگوں کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ ملاقات کے خاتمے پر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے ہال کے دروازے

تک آئے اور دعا دی اللہ آپ کو کامیاب کرے۔ آسام سے واپسی پر تین مئی کو انتقال فرمایا۔ انّا للہِ و انّا الیہِ راجعُون۔

جامعہ ملیّہ اسلامیہ کا تصوّر اور مقصد

ہندوستان جب انگریزوں کا غلام بن گیا اور ان کا غلبہ اور تسلّط پورے طور پر قائم ہو گیا تو انھوں نے اپنی ضرورت اور [illegible] کے پیشِ نظر یہاں ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا جس سے اُن کو اپنی حکومت کو چلانے کے لیے کارندے تیار ملیں۔ گو وہ نسلی لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر ذہنی طور سے انگریز ہوں جس کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے فرمایا تھا:

یوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ عیسائی مشنریوں نے بھی ہندوستانیوں پر یلغار کر دی اور سارے ملک میں تعلیمی ادارے قائم ہو گئے اسپتالوں اور خدمتِ خلق کے بہانے ہندوستانیوں کے دین و دھرم اور ان کے اخلاق و اطوار کو بدلنے کی کوشش کی۔ سارے ملک میں اس طرح کے اداروں کے جال بچھا دیے جن کے بارے میں اقبال نے فرمایا:

یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
اک سازش ہے دین و مروّت کے خلاف

مسلمانوں کے لیے یہ سب نظام ہائے تعلیم اور یہ تعلیمی ادارے مہلک اور ناقابلِ قبول تھے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی ضرورتوں کے پیشِ نظر حکومت سے آزاد اور بے نیاز ہو کر اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے شروع کیے۔

اولاً دینی تعلیمی ادارے انگریزوں سے بیزاری اور نفرت پر قائم ہوئے اور ان کا نصابِ تعلیم مسلمانوں کی دینی ضرورت مثلاً مسجدوں میں امامت اور دینی

کاتیب ومدارس میں صرف دینیات کی تعلیم تک تھا۔ ان سے جو لوگ فارغ ہوئے
ن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا :

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے:
اس کو کیا جانیں بچارے دو رکعت کے یہ امام

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

یہ بتانِ عصرِ حاضر جو بنے ہیں مدرسہ میں
نہ تراشش آذرانہ، نہ ادائے کافرانہ

اس کے ردِ عمل میں علی گڑھ کالج قائم ہوا جس میں زیادہ تر علوم جدیدہ اور
سائنس کی تعلیم پر زور دیا گیا اسلامیات اور دینیات کی تعلیم کا جو نصاب شامل کیا
گیا وہ کافی اور موثر ثابت نہ ہوسکا اور لوگوں کو کہنے کا موقعہ ملا کہ جس کو دنیا برباد کرنی
ہو وہ دیوبند جائے اور جس کو آخرت برباد کرنی ہو وہ علی گڑھ جائے۔

اور اکبرؔ نے فرمایا کہ :

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

لہٰذا یہ ضرورت ابھر کر سامنے آئی کہ مسلمانوں کو ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے
جس سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی دونوں ضرورتیں پوری ہوں۔ علی گڑھ کالج جب
مسلم یونیورسٹی بننے کے مرحلے میں آیا تو مسلمانوں نے چاہا کہ وہ ایسی یونی ورسٹی ہو جس
میں مسلمانوں کو پورا اختیار ہو کہ وہ اپنی دینی اور دنیوی ضرورتوں کے پیشِ نظر نصابِ تعلیم
رائج کریں اور اس کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو مگر حکومتِ وقت نے مسلمانوں
کے اس مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔ اس وقت تک انگریزوں سے نفرت اور بیزاری

میں شدت پیدا ہو چکی تھی۔ آزادیِ وطن کی تحریک شروع ہو چکی تھی، مسلمان بھی اس میں پیش پیش تھے۔ خلافت اور مسلم لیگ کی تحریکیں بھی مسلمانوں میں چل پڑی تھیں:

بولی اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پر دے دو۔

اقبالؔ نے فرمایا:

لا کہیں سے ڈھونڈ کے اسلاف کے قلب و جگر

تا خلافت کی بنا دُنیا میں ہو وے استوار

لہٰذا مسلمانوں نے چاہا کہ حکومت سے آزاد اور بے نیاز ہو کر اپنی تعلیم گاہیں قائم کریں لہٰذا علی گڑھ ہی میں ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیّہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی — اس کے بانیوں میں مولانا محمد علی جوہرؔ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمود الحسن، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خواجہ عبدالمجید اور ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمہم اللہ وغیرہ حضرات تھے۔ اس کے حامیوں میں مہاتما گاندھی اور مسٹر جمنالال بجاج بھی تھے۔ آزادیِ وطن کی تحریک میں حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اتار چڑھاؤ کا پیدا ہونا فطری بات تھی۔ مصطفےٰ کمال نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اعدا اسلام کی سازشوں کا شکار ہو کر خلافت کا منصب ہی ختم کر دیا:

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا

تو ہندوستان میں خلافت تحریک کی بنیاد ہی ختم ہو گئی اور مسلمانوں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ جامعہ ملیّہ اسلامیہ کا چلانا بھی مشکل ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے کارکنانِ جامعہ کو مشورہ دیا کہ جامعہ کو چلانا اب ممکن نظر نہیں آتا لہٰذا جامعہ کو بند ہی کر دینا چاہیے — استاذِ محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکل آئے تھے اور جامعہ میں داخلہ لیا تھا، جامعہ کے قیام میں عملاً پیش پیش تھے۔ جامعہ کے پہلے طلباء کے زمرے میں فراغت کرنے کے بعد اعلا تعلیم کے لیے جرمنی چلے گئے تھے ان سے مشورہ چاہا گیا۔ انھوں نے نہایت حوصلہ مندانہ جواب دیا کہ جامعہ کو بند نہ کیجیے، کچھ دنوں اور چلائیے میری تعلیم اب ختم ہی ہونے والی ہے میں ہندوستان آکر انشاء اللہ اپنی خدمات

پیش کر دوں گا اور اپنی زندگی وقف کر دوں گا اور جامعہ کو چلانے کی کوشش کروں گا۔
چنانچہ جامعہ بند نہ ہوئی۔ وطن آکر انھوں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اللہ اللہ کیسا
ایمان و توکل تھا، خود اعتمادی تھی ـــــ کیسی اولو العزمی تھی ـــــ
جرمنی میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب سے بھی اپنے عزم و
ارادے کا اظہار کیا۔ ان دونوں حضرات نے بھی اپنی رفاقت کا ان سے عہد کیا۔ ان تینوں
حضرات نے ہندوستان آکر اپنی خدمات جامعہ کو پیش کر دیں اور ذاکر صاحب نئے
دور کے شیخ الجامعہ ہوئے۔ استادِ محترم نے جامعہ کی خدمت کے لیے سب سے پہلا
قدم یہ اٹھایا کہ قلندری یعنی فقیری اختیار کی۔ اور اپنی زندگی کو انتہائی سادہ بنایا ـــ
حالانکہ تین سال یورپ میں رہ چکے تھے۔
یورپ کی رہائش کے عادی ہو چکے تھے۔ معیارِ زندگی بڑھانے میں بڑا مزہ آتا ہے،
مگر معیارِ زندگی گرانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ فقیری اختیار کرنا آسان نہیں ہے
پھر اپنے رفقائے کار کو فقیری اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔
یہاں میرے پاس جامعہ کے بانیوں کے وہ اقوال اور نوشتے نہیں ہیں جس میں
جامعہ کے تصوّر، جامعہ کے نصب العین اور اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں جو جامعہ
کے یومِ تاسیس کے موقعوں پر اکثر دہرائے جاتے رہے ہیں لیکن استادِ محترم کو مختصراً
یہ فرماتے اکثر سنا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مقصد ہے کہ یہاں سچے مسلمان اور اچھے
انسان تیار ہوں اور وہ دین و ملّت اور قوم و وطن کے مخلص اور اچھے خادم ثابت ہوں۔
میرے خیال سے سچے مسلمان اور اچھے انسان کے لیے استادِ محترم کا وہی تصور
تھا جو اللہ اور اللہ کے رسول نے پیش فرمایا ہے اور جس کو اقبال نے بھی "مردِ مومن" کہا ہے۔
اگر اس وقت قرآن و سنّت اور اقبال کے مردِ مومن کے تصوّر کی وضاحت کرنے کی
کوشش کروں تو بات طول پکڑ جائے گی اور موضوع سے الگ ہو جائے گی۔ اس
موقعہ پر دو واقعے عرض کروں گا جن سے ان کی "اقبال دوستی" اور اقبال کے "مردِ مومن"
سے ان کی دلچسپی واضح ہو گی۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں جب اقبال کا انتقال ہوا تو ان سے

عقیدت کی بنا پر میں بہت متاثر ہوا۔ میں اس وقت جامعہ کالج کے طلبہ کے ترجمان "جوہر" جو قلمی پرچہ تھا اس کا ایڈیٹر تھا اور اس کا اقبال نمبر نکالنا چاہا۔ ہمارے اساتذۂ کرام اور کالج کے احباب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ کچھ حضرات نے اپنے لیے عنوان پسند کر کے اس پر لکھنے کا بھی وعدہ کیا۔ مسئلہ اس کی طباعت کا تھا۔ استادِ محترم ہماری انجمنِ اتحاد کے صدر تھے۔ طباعت کے مصارف کا وہی انتظام فرما سکتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض پیش کی۔ سن کر فرمایا۔ اقبال" کا بڑا اونچا مقام ہے اور جامعہ کا بھی ایک مقام ہے۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ آپ لوگ اقبال" اور جامعہ کے شایانِ شان اقبال نمبر نکال سکیں گے؟ لہٰذا بہتر ہے قلمی ہی اقبال نمبر نکالیے۔ ذرا ٹائیٹل کسی آرٹسٹ سے بنوا لیجیے گا اور جامعہ کی لائبریری میں رکھ دیجیے گا۔ میں نے عرض کیا کہ انشاء اللہ اقبالؔ اور جامعہ کے شایانِ شان ہی نکالنے کی ہم کوشش کریں گے۔ ان کی خدمت میں اقبال" پر لکھنے کے لیے جن اساتذۂ کرام اور احباب نے وعدہ فرمایا تھا اور اپنے لیے جو عنوان تجویز کیا تھا ان کی فہرست ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ ان میں ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر محمد سرور، مولانا محمد اسلم وغیرہم حضرات تھے۔ فہرست پر نظر ڈال کر خوش ہو گئے اور فرمایا اچھا تو اگر آپ اقبالؔ پر دس اچھے مضامین لکھوانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کی طباعت کی ذمہ داری میری۔ میں نہایت خوش اور مسرور ان کے کمرے سے باہر آیا۔ پھر ہر مرحلے پر اقبال نمبر کے سلسلے میں وہ اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتے رہے۔ کشمیر گئے تو اقبالؔ کی وہ نادر تصویر لا کر دی جو اقبال نمبر میں شائع ہوئی۔ اپنے دو گروپ فوٹو کھنچوانے پر آمادہ ہوئے جو اقبال نمبر میں شائع ہوئے۔ اقبال پر اپنا گراں قدر پیام دیا جو ہے تو ایک پیام مگر ایک جامع مضمون کی شکل میں ہے۔ جب اقبال نمبر شائع ہو گیا تو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انجمنِ اتحاد کا جشن مسند نشینی منعقد ہوا تو اقبال نمبر ہاتھ میں اٹھا کر فرمایا کہ آئندہ جشن مسند نشینی کے موقع پر ایسی ہی کوئی چیز پیش کرنی چاہیے۔ چنانچہ دوسرے سال جوہر کا عبدالحق نمبر شائع کیا گیا۔ مزید

فرمایا کہ جشن کے موقع پر کوئی چیز تحفے کے طور پر پیش کیجیے جو یادگار رہے۔ میں نے عرض کیا کہ وہ کیا ہو۔ اُٹھے اور اپنے مکان کے اندر تشریف لے گئے۔ ہاتھ میں بالِ جبریل لے کر باہر آئے اور صفحہ کھول کر پیش کر دیا جس پر لکھا ہوا تھا :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

فرمایا یہ پورا صفحہ خوش خط بڑے سائز کے کارڈ پر چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کر دیجیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ خود انھوں نے اقبال کا مردِ مومن بننے کی کوشش کی اور ہمیں بھی بنانا چاہا۔ جو سچا مسلمان ہوگا وہ لازماً اچھا انسان بھی ہوگا۔ سچا مسلمان اور اچھا انسان بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسی فکر و خیال اور اخلاق و کردار کے اساتذۂ کرام بھی ہوں۔

اساتذۂ کرام اور کارکنانِ جامعہ

اللہ کے فضل و کرم سے استادِ محترم کو شروع میں نہایت مخلص اور باکردار رفقاء مل گئے تھے اور جو بعد میں آئے وہ ان کے اخلاق و کردار کے رنگ میں ڈھل گئے۔ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ جرمنی میں قیام کے دوران جب انھوں نے ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو چلانے کے سلسلے میں اپنے عزم و ارادے کا اظہار کیا تو ان حضرات نے اپنا مخلصانہ تعاون پیش کر دیا اور تازیست اسی عہدِ رفاقت کو وفاداری سے نباہا اور سخت سے سخت حالات میں بھی ان کے عزم و ارادے میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔

ہندوستان آنے پر جن لوگوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ چلانے کے لیے عہدِ رفاقت کیا ان میں مولانا اسلم جیراجپوری مولانا عبدالحئی فاروقی، مولانا سعد الدین انصاری ندوی ڈاکٹر سعید انصاری، محمد شفیق الرحمٰن قدوائی، جناب فیاض احمد، پروفیسر اے جی کیلاٹ جناب ارشاد الحسن، پروفیسر محمد عاقل، پروفیسر محمد سرور جناب برکت علی اور جناب علی احمد

وغیرہ حضرات تھے جو سب کے سب اخلاص و کردار میں پیش پیش تھے۔ اس زمانے میں جو لوگ جامعہ سے فارغ ہوتے گئے بیشتر نے اپنی خدمات جامعہ کو پیش کر دیں ان میں طیّب بھائی، بدر الحسن صاحب، محمد یوسف صاحب اور برکت علی فراق صاحب وغیرہ ہیں۔ یہ سب کے سب اخلاص، اخلاق و کردار اور ایثار قربانی کے جذبے میں سرشار تھے مگر فطری ہم آہنگی میں کمی ضرور تھی۔ سچّا مسلمان بنانے کے لیے اسلام کا تصور سب میں واضح ہونا چاہیے تھا جس کی کمی تھی۔ ہمارے کوئی استاد اہلِ قرآن تھے، کوئی اہلِ حدیث اور کوئی اہلِ فقہ، کچھ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ حضرات بھی تھے۔ اس کے باوجود اس زمانے میں جامعہ کا ماحول بڑا دین دارانہ تھا۔ بڑے اخلاص کا، ایثار کا، قربانیوں کا فرض شناسی کا بھائی چارے اور اخوت و محبت کا، جس کا نقشہ میرے لیے پیش کرنا مشکل ہے، نماز باجماعت کا پورا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہر دار الاقامہ میں اساتذہ کی نگرانی میں نماز باجماعت ادا ہوتی تھی۔ یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب جامعہ قرول باغ میں تھا۔

۱۹۴۰ء میں میرے جامعہ چھوڑنے کے بعد جامعہ میں تیزی سے اور ہر جہت سے توسیع ہونی شروع ہوئی۔ لوگوں کو جامعہ کا مستقبل درخشاں نظر آنے لگا تو لوگوں کی جامعہ کی طرف لپک بھی شروع ہوئی۔ اور جامعہ کی خدمت کے لیے اخلاص اور ایثار و قربانی کا جذبہ بھی کم ہونے لگا۔ ۱۹۴۴ء میں جامعہ جوبلی کے بعد ہی ماحول میں تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ آزادی کے بعد جب جامعہ حکومت کی سرپرستی میں آگئی تو عُسرت کا دور ختم ہوا اور ایثار و قربانی کی جگہ جامعہ سے استفادہ کا دور آیا۔ رہی سہی کسر استادِ محترم کے علی گڑھ جانے سے پوری ہو گئی اور ان کے بعد جو بزرگ شیخ الجامعہ ہوئے جن میں بیشتر خوبیاں تو تھیں ذاکر صاحب کا ساتھ روزِ اوّل سے دیا تھا مگر اسلام سے وہ دلچسپی نہیں تھی۔ خود سیکولر تھے اور موقعہ ملا تو جامعہ کو سیکولر بنانے کی کوشش کی۔ آزادی کے دور سے پہلے جو گنے چنے افراد جامعہ سے فارغ ہوئے تھے ان میں اکثر دوسرے مقامات پر منتقل ہو گئے۔ جن کے اندر دین و ملت

قوم و وطن کی خدمت کا جذبہ باقی رہا وہ کسی نہ کسی تعلیمی ادارے کو چلانے میں خرض شناس ثابت ہوئے۔ لیکن آزادی کے بعد حالات ہی بدل گئے۔ جامعہ بدل گئی۔ اس کی دین داری اور اسلامیت کے ساتھ اس کی انفرادیت اور اس کا اخلاق و کردار بھی بدل گیا۔ میں ادب و افسوس کے ساتھ عرض کروں گا کہ آزادی کے بعد جو لوگ شیخ الجامعہ ہوئے ان کو اسلام سے دلچسپی اور تعلق نہیں تھا۔ ان کو جامعہ ملیہ کے نام میں اسلامیہ لگا رہنا پسند نہیں تھا۔ میرے خیال میں اب جامعہ کی کوئی خصوصیت اور امتیازی شان باقی نہیں رہی۔ آزادی سے پہلے جب تک جامعہ کی ڈگریوں کو حکومت نے تسلیم نہیں کیا تھا اس وقت لوگ دیوبند اور علی گڑھ کے صف میں جامعہ ملیہ کو رکھ کر کہتے تھے :

"جس کو دنیا برباد کرنی ہو وہ دیوبند جائے جس کو آخرت برباد کرنی ہو وہ علی گڑھ جائے اور جس کو دنیا و آخرت دونوں برباد کرنی ہو وہ جامعہ ملیہ جائے۔"

لیکن اب جامعہ کی دنیا بحال ہو گئی ہے اور وہ دوسری علی گڑھ بن رہی ہے اللہ کرے کہ جامعہ کی اسلامیت بھی بحال ہو جائے۔ میں اللہ کے فضل و کرم سے مایوس نہیں ہوں اللہ استادِ محترم ذاکر حسین صاحب کے اخلاص اور قربانیوں کو ضرور قبول فرمائے گا۔ قول اقبال :

اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات و دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

عتیق احمد صدیقی

ڈاکٹر ذاکر حسین کا نظریۂ تعلیم

قومی تعمیر کا کام ٹھوس تعلیمی بنیادوں پر ہی انجام دیا جاسکتا ہے، جیسا تعلیمی نظام ہوگا، ویسے ہی ذہن تیار ہوں گے اور تعلیم گاہوں میں جیسے ذہن تیار ہوں گے، ویسے ہی معاشرے کی اُٹھان ہوگی۔ آج کی تعلیم گاہیں کل کے ذمہ دار شہریوں کی سمت و رفتار کا تعین کرتی ہیں۔ آزاد، بیدار اور باشعور قوموں نے اگر ایک طرف معاشرے کی نبض پر انگلیاں رکھی ہیں تو دوسری طرف تعلیم گاہوں کے نظام اور اُن کی کارکردگی کو بھی قومی ضرورتوں اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ نظامِ تعلیم اور تعلیم گاہوں کو نہ صرف اپنی روایات، اقدار اور نظریات کی پاسبانی کا ذریعہ بنایا ہے بلکہ مستقبل کے خوابوں کی تعبیر بھی انہیں کے ذریعہ تلاش کی ہے۔ اپنے حوصلوں اُمنگوں اور خواہش تعمیر کی صورت گری کے لیے تعلیم گاہوں کا ہی سہارا لیا ہے۔

مگر کسی بھی مفید نظام کی طرح نظامِ تعلیم بھی خود رو نہیں ہوتا اور ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ زمانۂ دراز سے کوئی نظامِ تعلیم قائم کرنے میں ہمارا اختیار نہ رہا۔ اٹھارویں صدی ملک میں افراتفری کی صدی تھی۔ سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی سبھی ادارے بدنظمی اور ابتری کا شکار تھے۔ اُن میں سے کسی بھی ادارے سے مفید ثمرات پیدا نہیں ہو رہے تھے۔ گویا پورا نظام کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو استحکام نصیب ہوا، ایک علاقہ میں سیاسی غلبہ حاصل ہو گیا اور پورے ملک پر اپنی حکمرانی کے آثار نظر آنے لگے تو انہوں نے تعلیم کی طرف بھی توجہ کی تاکہ اِس

سمت سے بھی اپنی گرفت کو مضبوط کیا جا سکے۔ فارسی اور عربی علم وادب کی تعلیم کے لیے وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۰ء میں کلکتہ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا، جس سے عام مشرقی علوم سے (جن میں سنسکرت بھی شامل تھی) دلچسپی بڑھی۔ ۱۷۹۱ء میں جانتھن ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت کالج قائم کیا۔ یہ پُرانے ہی نظام تعلیم کی تجدید تھی جو غیروں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کے مقاصد دو گونہ تھے (۱) یہاں کے باشندوں کی تعلیم کا انتظام اور ان کو اپنی قدیم ذہنی شائستگی حاصل ہو۔ (۲) انگریزوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے جو یہاں کے علوم سے واقف ہو۔ ہندو مسلم تہذیب، اُن کے عقائد اور رسم ورواج کو سمجھے اور اس طرح ملکی زندگی میں دخیل ہو کر اپنی حکومت کے استحکام کا سبب بنے۔ انہیں میں مستشرقین کی ایک جماعت بھی پیدا ہوئی جو ہندوستانی علوم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، اُن میں یوروپی علوم کی پیوندکاری کرنا چاہتی تھی تاکہ دونوں قوموں کے درمیان ایک، ذہنی ہم آہنگی کی راہیں ہموار ہوں اور ہندوستان کے لوگ یورپ کے علوم مفیدہ سے بہرہ یاب ہوں لیکن انیسویں صدی کے شروع میں ہی اس نقطۂ نظر میں تبدیلی آگئی۔ مستشرقین کی اس حکمتِ عملی کی سخت مخالفت شروع ہوگئی۔ اس میں کئی عوامل کار فرما تھے۔ عیسائی مشنری جماعتوں کو اپنی تہذیب، مذہب اور علوم کی برتری کے احساس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان مذہبی، اخلاقی اور سماجی گمراہی میں مبتلا ہیں اور انہیں سچے مذہب میں لانا ضروری ہے۔ اس لیے انہوں نے تعلیم کو عیسائیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنانے کی کوششیں شروع کردیں۔ حکمرانوں کو خدشہ پیدا ہوا کہ اگر مشرقی نظامِ تعلیم قائم رہا تو اُن کے سیاسی عزائم کی تکمیل میں دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں اور اس کے ختم کرنے کے بعد مغربی اثرات کے ذریعہ ہندوستانی جسم و روح کو تسخیر کرنا آسان ہوگا۔ دکھاوے کے لیے الزام یہ تراشا گیا کہ مشرقی علوم بیکارِ محض ہیں (اور مادی تہذیب کی پیش قدمی میں اب اُن کی حیثیت مشتبہ ہو

بھی گئی تھی)، اور اُن سے ہندوستان کی جہالت، تعصب اور توہم پرستی میں اضافے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں جس نئی تعلیمی حکمتِ عملی کا آغاز ہوا، اس کا یہ مقصد قرار دیا گیا کہ ہندوستان میں ایک نیا طبقہ پیدا کیا جائے ۔۔۔ لارڈ میکالے کے الفاظ میں:

> "ایک ایسا طبقہ جو ہمارے اور کروڑوں کی اس مخلوق کے درمیان جس پر ہم حکمراں ہیں، ترجمان بن جائے۔ ایسے لوگوں کا طبقہ جو نسل اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی مگر اپنے مذاق، اخلاق، خیالات اور عقل کے لحاظ سے انگریز ہوں۔"

کوئی بھی نظامِ تعلیم حکومت یا مذہب ہی کی قوت پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس مجوزہ نظام کی پشت پر حکومت کی قوت نے کام کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۴۴ء میں سرکاری ملازمتوں کے لیے انگریزی کی واقفیت ضروری قرار دی گئی۔ رفتہ رفتہ تعلیمات کے محکمے قائم کیے گئے اور ابتدائی مدارس سے لے کر یونی ورسٹی تک کا ایک مربوط نظام پورے ہندوستان کے لیے مرتب کیا گیا۔

یہ امر صرف حکومت اور انگریزوں تک ہی محدود نہیں رہا ۔۔ زمانے کی ہوا کا رُخ دیکھ کر بہت سے دُور اندیش اور جدت پسند ہندوستانیوں نے بھی اس نئے نظام کو اختیار کیا۔ بلکہ اس کی ترویج کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں راجا رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔

جزوی طور پر انگریزوں کا یہ مقصد پورا بھی ہوا۔ ان کے سیاسی غلبہ کو استحکام حاصل ہوا، یورپ کا تمدن ہندوستان میں پھیل گیا۔ ہماری تہذیب کے سوتے خشک ہونے لگے۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا تعلق اپنی تاریخ اور تہذیب سے منقطع ہو گیا۔ اقدار پامال ہو گئیں۔ مادیت کا غلبہ اس طرح ہوا کہ تمام روحانی رجحانات رخصت ہو گئے ۔۔ مذہب بھی زد میں آیا، لیکن ان نقصانات کے ساتھ ہی نئے علوم کی برکات بھی نمودار

ہونے لگیں، روشن خیالی، وسیع النظری، جمہوریت پسندی نے آزادیٔ وطن کی خواہش کو جنم دیا۔ غلامی اور اس سے پیدا ہونے والے نقصانات کو محسوس کیا جانے لگا۔ مغربی تہذیب کے تضادات اور مضرات عیاں ہونے لگے۔ ماضی کی بازیافت اور مذہب و تہذیب کے تحفظ کا احساس بڑھنے لگا۔ بیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے حالات نے بالکل نیا رُخ اختیار کر لیا۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر اور ایسے ہی دوسرے رہنماؤں کی قیادت میں ہندوستانی عوام ایک نئی منزل کی جانب گامزن ہو گئے۔

گاندھی جی صرف ایک سیاسی تحریک کے رہنما نہیں تھے، بلکہ صحیح معنی میں وہ مدبّر اور قائد تھے۔ سیاسی رہنمائی کے ساتھ ساتھ وہ اخلاقی تربیت، وسیع تر بنیادوں پر قومی تعمیر اور ایک نئے مستقبل کی تشکیل کے پروگرام بھی چلا رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء تک عدم تشدد، عدم تعاون اور سول نافرمانی وغیرہ کے تصوّرات کافی مقبول ہو چکے تھے۔ خلافت تحریک نے ان کو اور زیادہ عام کر دیا۔ انگریزی نظام سے پہلے ہی بددلی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے ناقص اور ضرر رساں ہونے کا احساس بھی دلوں میں تھا۔ اسی وقت میں گاندھی جی نے آزاد قومی تعلیم کا نعرہ دیا کہ یا تو تعلیمی ادارے سرکاری امداد لینا بند کر دیں، اور قومی تعمیر کے نئے تقاضوں کے مطابق نیا نظامِ تعلیم مقرر کریں۔ یا طلبا امدادی اداروں کا بائیکاٹ کریں۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد یہ پیغام لے کر علی گڑھ پہنچے۔ طلبا پس و پیش میں تھے، اتنا بڑا فیصلہ کیسے کریں۔ اس فیصلے کے نتائج بھی کچھ کم مہیب نہ تھے۔ لیکن علی برادران کے پُر جوش خلوص نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ذاکر حسین خاں جو اس وقت ایم۔ اے کے طالبِ علم تھے اور جونیر لکچرر بھی، خود اس طوفان میں کود پڑے اور طلبا کی ایک بڑی تعداد کو کالج چھوڑنے پر آمادہ کر لیا۔ لیکن طلبا کا بجا طور پر یہ مطالبہ تھا کہ اگر اس ناقص تعلیم کو ترک کرنا ہی ہے تو قوم پر لازم ہے کہ وہ بہتر متبادل تعلیم کا انتظام کرے اور ایسے ادارے قائم کرے جہاں یہ طلبا داخل ہو کر اپنی تعلیم کی تکمیل کر سکیں۔

تحریک خلافت کے اکابر ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ کو ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی جامع مسجد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح مولانا محمود الحسن صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اگرچہ عالم بے سروسامانی کا تھا لیکن مقاصد بلند تھے۔ "یہ عام درس گاہ نہیں تھی، بلکہ حریت پسندوں کا قلعہ، قومی نظریات اور قومی تشکیل نو کی تجربہ گاہ تھی۔ سارے ملک سے جوشیلے نوجوان قومی تعلیم کے اس ادارے کی خدمت کرنے کے لیے بڑی امنگوں اور امیدوں کے ساتھ ٹوٹ پڑے تھے۔"[1] خود مولانا محمد علی جوہر یہاں اسلام اور وطن کے تصورات پر لکچر دیتے، اور نوجوانوں میں نیا ولولہ پیدا کر دیتے۔ باقاعدہ کلاسیں نہیں تھیں، لیکن :

"تقریباً ایک سال تک طلبا کو چھ ہفتے کے ایک کورس میں شرکت کرنا پڑتی جس میں انھیں خلافت، اور ترکِ موالات کی تحریکوں کے اصول اور طریقِ کار کی تعلیم دی جاتی تاکہ وہ ملک میں دورے کر کے ان تحریکوں کی تبلیغ و اشاعت کر سکیں۔ اس کورس کو ختم کر کے وہ وفود کی شکل میں ملک کے مختلف حصوں میں جاتے تھے۔"[2]

ذاکر صاحب ان سیاسی وفود کی شکل میں کبھی نہیں گئے لیکن اس تربیت نے اُن کے قومی جذبات کی سرشاری کو پختہ تر کر دیا۔ وہ جلد ہی جامعہ کے اساتذہ میں شامل ہو گئے۔ جامعہ کی مجلسِ منتظمہ کے رکن بھی بن گئے اور شعبۂ نشر و اشاعت کے انچارج بھی۔ یہیں سے اُن کے تعلیمی تجربات کا وہ دور شروع ہوا جو مسلسل چالیس سال تک جاری رہا۔ تاآنکہ وہ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے سبک دوش ہوئے۔

یہ طویل دوران کے تعلیمی تجربے، تعمیر و تشکیل، نظریہ سازی اور اس کے عمل درآمد کا دور تھا۔ ساتھ ہی یہ بے لوث خدمت، بے مثال ایثار و قربانی، غیر متزلزل ایمان و یقین اور کڑی آزمائشوں کا دور بھی تھا۔ انھوں نے اس تمام مدت میں خود کو سیاست سے،

---

[1] : محمد مجیب : ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۲۵ ۔ [2] محمد مجیب ، ذاکر حسین ص ۲۵

عہدوں سے، مادّی منفعتوں سے دور رکھا۔ یوں نہیں کہ مواقع نہیں آئے لیکن تعلیم اور جامعہ ملیہ سے انہوں نے جو عہد استوار کیا تھا اس پر وہ اس وقت تک قائم رہے جب تک اُن کی صحت نے ہی جواب نہ دے دیا۔ یہ مستقل مزاجی ان کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی عمر کے چودھویں سال میں جو مضمون لکھا تھا، اسی میں اُن کی فطرت جھلکتی نظر آتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"طالبِ علم اس دنیا میں کچھ ترقی نہیں کرسکتا، وہ اپنا اثر دوسروں پر نہیں ڈال سکتا، جب تک کہ وہ استقلال کے ساتھ اپنی اخلاقی سطح دنیا کی مشکلوں میں بلند نہ رکھے۔ وہ شخص ہرگز طالبِ علم کہلانے کا مستحق نہیں جو اپنے فرائض کو استقلال اور سنجیدگی سے پورا نہ کرے۔ اس کو ہرگز اپنے دل میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا خیال کرے گا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ بلکہ اس کو ہمّت کے ساتھ کیے جانا چاہیے کیوں کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ ضرور اپنے کام میں کامیاب ہوگا۔"[1]

اور آگے چل کر انہوں نے جو ایک کہانی لکھی "مرغی کا نرالا بچہ" اور جو بعد میں مکتبہ جامعہ کی اُردو ریڈر میں شامل ہوئی۔ اس میں بھی انہوں نے اس خیال کو بچوں کے ذہن نشین کرایا۔ مرغی کا بچہ اپنی ناتواں چونچ سے انڈے کی دیوار توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ نتیجہ! کھٹ کھٹ کرتے رہو، کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ تعلیم بھی کھٹ کھٹ کرنے ہی کا عمل ہے کہ اس میں جلدی نہیں کی جاسکتی۔ بچوں کے ذہن کی تشکیل ایک خاص رفتار سے ہی ہوسکتی ہے۔ انفرادی یا اجتماعی تعلیمی کوششوں کے نتائج فوری برآمد نہیں ہوتے۔ صبر و تحمل کے ساتھ متواتر کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب نے بے انتہا نامساعد حالات میں اپنے کام کو جاری رکھا۔ وہ آزمایش کی دھیمی آنچ میں تپتے رہے۔ کڑھتے رہے اور سنورتے رہے۔ اس پس منظر کے ساتھ اُن کے تعلیمی نظریات محض اُن کے تخیّل کی پیداوار نہیں بلکہ ۱۹۲۰ء کے بعد پیدا ہونے والی قومی آرزوؤں اور

---

[1] : بحوالہ محمد مجیب: ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۱۳

اسکوں، آزاد ہندوستان میں ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے خواب، سچے اسلامی اخلاق، گاندھی واد اور وسیع المشرب انسانی اقدار کے آئینہ دار ہیں۔ ان تعلیمی نظریات کو ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آئینہ میں "بنیادی تعلیم" کی قومی دستاویز میں اور تعلیم کے مسائل پر ان کے مقالات وخطبات میں دیکھ سکتے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام جن حالات میں عمل میں آیا، ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس ادارے کی بنیاد میں ہی قربانی، حریت پسندی، تجدد فکر، تعلیم کے فرسودہ نظام سے بغاوت اور نئے نظام کی تشکیل کے جذبات موجزن تھے۔ خلافت تحریک کی ناکامی کے بعد مسلم سیاستدان مایوسی میں بھی مبتلا ہوئے اور سیاسی جھمیلوں میں بھی پھنس گئے تو جامعہ کا وجود ڈانواڈول ہونے لگا اور یہ سوچا جانے لگا کہ اُسے بند کر دیا جائے۔ اس وقت جرمنی میں اعلا تعلیم حاصل کرنے والے تین نوجوانوں کو یہ اطلاع ملی تو انہوں نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ جرمنی سے اپنی واپسی تک جامعہ کو بند نہ کرنے کی درخواست کی، اور خود کو جامعہ کے لیے وقف کرنے کا عہد کر لیا۔ یہ تین نوجوان تھے ـــــ ذاکر حسین، عابد حسین اور محمد مجیب، اور پھر تینوں نے ہی اپنے اور بہت سے رفیقوں کے ساتھ، اس عہد کو پورا کر دکھایا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کے آزاد ہونے تک جامعہ کو مادّی وسائل کی آسودگی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے وابستگان کی تاریخ مثالیت پسندی اور ایثار کی شمعوں سے روشن ہے۔ ذاکر صاحب اس گروہ کے سرخیل تھے۔ تعلیم، تعلیم کے نئے سانچوں کی تشکیل اور مخصوص تصوّرات کے ساتھ نئی نسل کی تربیت اُن کا نصب العین بن گیا۔ جامعہ ایک تعلیم گاہ بھی تھی۔ اعلا تعلیمی نصب العین کی نقیب بھی اور نئے تصورات کی تجربہ گاہ بھی۔ وسائل کی فراوانی کے ساتھ تجربوں کی نوعیت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے، لیکن بے سروسامانی کے عالم میں وہی تجربے کیے جا سکتے ہیں جن کی صحت اور افادیت پر یقینِ کامل ہو اور انسان اُسے عقیدے کا درجہ دے دے۔ ذاکر صاحب نے یہاں بہت سے تجربے کیے۔ ان تجربوں کے لیے جو ماحول پیدا کیا، پہلے اُسے پروفیسر محمد مجیب کی زبانی سنیے:

"جامعہ ملیہ نے اسلامی روایات اور تمدن کی نمایندگی کرنے میں مسلمانوں کی اکثریت کے تعصبات کو راہ نہیں دی اور نہ اسلام کی تعلیمات کی رسمی یا سیاسی صورتوں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کیا۔ سچ پوچھیے تو اس نے اپنا ایک الگ اسلامی کردار پیدا کیا اور اس عمل میں مسلمانوں کی رسمی روایات اور نظریات کی پابندی کرنے سے زیادہ ان سے گریز کیا۔ ذاکر صاحب نے اس کے باوجود کہ جاندار چیزوں کی تصویر کشی مسلمانوں کے مروجہ عقیدے کی رُو سے ناجائز ہے، مدرسے کے نصاب میں مصوری کے مضمون کو داخل کر کے مخلوط تعلیم کے رواج کے لیے راستہ ہموار کیا۔ غرض مذہبی تشدد کو کسی حالت میں راہ نہیں دی۔ قرآن کی ایک آیت لا اکراہ فی الدین کے مطابق رواداری سے متعلق ان کے عمل سے ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا، جس میں لوگ آزادی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر ظاہر کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی رائے اور عقیدے کے باب میں افہام و تفہیم سے کام لیتے تھے۔ ذاکر صاحب کی نظر میں کوئی مسلمان اچھا اور سچا مسلمان نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ اچھا اور سچا ہندوستانی نہ ہو۔ مسلمان کے لیے اچھا اور سچا مسلمان ہونے کے اس معیار پر پورا اترنے کے معنیٰ یہ تھے کہ قومی ترقی کے لیے جو کچھ بھی ضروری ہے، وہ سب کا سب اصولاً اور عملاً تسلیم کرے۔ مشین کو تسلیم کرے کارخانے کے شور و غل اور دھویں دھکڑ کو تسلیم کرے۔ ان تمام تکنیکی تدبیروں کو تسلیم کرے جو کارخانے اور مشین کے لیے ضروری ہیں اور یہ اس لیے کہ ایک صنعتی سماج میں بھی اپنے پیشے سے متعلق تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنا یا مذہبی زبان میں ان تمام فرائض کو انجام دینا ہو گا جو اس نے جماعت کے مفاد میں اپنے اوپر عائد کیے ہیں۔" [1]

---

[1] : محمد مجیب۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۹۳-۹۲

۱۹۳۸ء میں جامعہ کے مقاصد کی خود ذاکر صاحب نے وضاحت کی۔ اس مضمون میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کن مقاصد کے لیے کوشاں تھے۔
۱۹۲۰ء میں جامعہ کچھ تصوّرات کے ساتھ وجود میں آئی تھی لیکن دھیرے دھیرے اس میں کام کرنے والوں نے ذاکر صاحب کی سرکردگی میں کچھ آئیڈیل بنا لیے۔ ذاکر صاحب اور ان کے رفیق ان کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ ۱۹۳۸ء میں جامعہ کے مقاصد کی جو توضیح ذاکر صاحب نے کی، اس سے ان کے تصوّرِ تعلیم کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مقاصد کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) جامعہ ملیہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو تمام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچّی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبّت، اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی میں حصّہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔

(۲) اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک ایسا مکمّل نصاب بنایا جائے اور اس کے مطابق ان بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں، تعلیم دے۔۔۔۔ وہ (جامعہ) علم کو زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے۔ جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ وہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لیے مفید ہو۔۔۔۔ جامعہ کا اصول یہ ہے کہ انسان روزی کو زندگی کا اُجرت کو خدمت کا تابع سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا رکن بنے[1]

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین: جامعہ ملیہ کیا ہے؟ مضمون مشمولہ جامعہ ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۰۱-۱۰۲

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ابتدائی درجات میں پروجکٹ میتھڈ اور اسائن منٹ میتھڈ کو اختیار کیا گیا۔ طلبہ کو انتظامی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں کہ ان میں اخلاقی آزادی، ذمہ داری، قانون اور ضابطہ کی پابندی کے احساسات پیدا ہوں۔ ابتدائی درجات سے ہی مذہب، فطرت اور انسانی زندگی کے مطالعہ کو نصاب کا محور بنایا گیا۔ مادری زبان ذریعۂ تعلیم کے اصول کے تحت اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ طلبا کے لیے مفید پیشوں اور حرفوں کی تربیت کا انتظام کیا گیا۔ ان میں بھی معلمی کی تربیت پر خاص توجہ دی گئی تاکہ یہاں کے سند یافتہ طالب علم "تعلیمی مجاہدوں کی حیثیت سے ملک میں ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور اشاعت کر سکیں"۔[1]

"کتابی مدرسہ" کے بجائے "کامی مدرسہ" کا تصور ذاکر صاحب جرمنی سے لیکر آئے اور ۱۹۲۵ء کے بعد انھوں نے اس تصور کو جامعہ میں عملی شکل دینے کی کوشش شروع کر دی۔ بدیہی نظر میں ہی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے جس تصور کو ملک گیر پیمانے پر عام کرنے کے لیے قدم اٹھایا، وہ چھوٹے پیمانے پر جامعہ میں کئی سال پہلے سے جاری تھا۔ البتہ حرفوں کی مدد سے تعلیم گاہوں کو مالی طور پر خود کفیل بنانے کے تصور سے ذاکر صاحب کو شدید اختلاف تھا، جس کا اظہار انھوں نے ۱۹۳۷ء کی واردھا کانفرنس میں کیا۔ اگرچہ انھوں نے گاندھی جی کے استدلال کے سامنے سپر ڈال دی لیکن بعد کے تجربے نے بھی ثابت کر دیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

جامعہ کی ان خصوصیات کا مرتا تھو دیا لنگر نے ان الفاظ میں اعتراف کیا:

Jamia was one of the first institution to try the project method to develop a community approach in Living and Learning, to encourage Self government amongst students and train them for responsible

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین: جامعہ کیا ہے؟ مضمون مشمولہ جامعہ ۱۹۳۸ء صفحہ ۲۰۲

CITIZENSHIP to arouse interest in art, and Above all inculcate in the Students and the teachers a spirit of idealism and social and national.

Services (1)

ہندوستان میں غیر ملکی حکمرانوں نے جو نظامِ تعلیم قائم کیا تھا، اس کے نقائص و مضرات کا بہت جلد احساس کر لیا گیا تھا: اس کا ہمارے مذہب و تہذیب پر بُرا اثر پڑ رہا ہے، تمدن تباہ ہو رہا ہے اور نوجوانوں کا اخلاق بگڑ رہا ہے، نئی نسل لارڈ میکالے کے خواب کی تعبیر پیش کر رہی ہے اور ہندوستانی روح سسک رہی ہے۔ یہ تصور کیا گیا کہ جب تک نظامِ تعلیم خود ہمارے ہاتھ میں نہ ہو۔ اس صورتِ حال کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے ادارے قائم کرنا شروع کیے لیکن یہ بھی تعلیم کے نظام میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ اُن سے کوئی مختلف نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ابتداء میں اگر اس نظام کی تمدنی خرابی سامنے تھی تو جلد ہی اُس کے معاشی اور اقتصادی نقصانات کا بھی احساس کیا جانے لگا: یہ صرف کتابی تعلیم ہے اور شہری آبادی تک محدود ہے۔ دیہات کے رہنے والے کروڑوں باشندے تعلیم سے محروم ہیں اور حکومت کے پاس سرمایہ نہیں کہ اُن کی ضرورت کے لیے نئے مدارس کھولے جا سکیں ۔ اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والے نوجوان نہ دیہات میں رہنا چاہتے ہیں، نہ اپنے آبائی پیشوں کو اختیار کرنا چاہتے ہیں، اُن کی شخصیت کی تعمیر نہیں ہو پاتی اور اُن کی بیشتر صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ دست کاری کے

---

(1) Amar Nath Vidyalankar · Consumation of National Values through education : Zakir Husain : Educationist and teacher P

کاموں سے اُن کو عار آتی ہے، وہ خود کوئی مفید روزگار اپنے لیے پیدا نہیں کر سکتے، اور بے روزگاروں کی فوج میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ بڑے کارخانوں اور مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے کثیر آبادی روزگار سے محروم ہو رہی ہے، تعلیم یافتہ نوجوان صرف سرکاری ملازمتوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں اور اس طرح یہ تعلیمی ادارے غلام سازی کے کارخانے بن گئے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں سرکاری تعلیمی اداروں کے مقاطعہ اور آزاد قومی تعلیمی اداروں کے قیام کا نعرہ انھیں احساسات کا ردِ عمل تھا اور کچھ ایسے ادارے قایم کیے گئے۔ جامعہ ملیہ ان میں سے ایک تھا ـــــ لیکن ان کی کفالت خود ایک مسئلہ بن گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ایسے چند اداروں کے قیام سے کروڑوں بچوں کی تعلیم کی ضرورت کو پورا بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں گاندھی جی نے تعلیم کے ایک نئے تصوّر کی تبلیغ شروع کی۔ یہ تصوّر بھی حالات کا پیدا کردہ تھا۔ ملک کے مختلف صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں بنیں تو عام تعلیم کا سوال بھی اُٹھا۔ ملکی قیادت تعلیم کو عام کرنے کی پابند تھی۔ اب ایک طرف تعلیم کے مقصد و منہاج کو بدلنے کا سوال تھا تو دوسری طرف اتنے بڑے پیمانے پر تعلیم کے انتظام کے لیے سرمایہ کا! لیکن اگر کسی طرح تعلیم گاہیں اپنا خرچ خود اٹھانے کے قابل ہو جائیں تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ ابتدائی اسکولوں میں کتابی تعلیم کے ساتھ دست کاری کی تعلیم و تربیت کو شامل کیا جائے بلکہ دستکاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہو اور ان تعلیم گاہوں میں اتنا مال پیدا کیا جائے کہ اُس کی فروخت سے جملہ اخراجات پورے ہو جائیں۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے واردھا میں ایک کانفرس بلا کر اپنے خیالات کو مباحثہ کے لیے پیش کیا۔ یعنی یہ کہ دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ تعلیمی نصاب کا مرکز کسی دست کاری کو بنایا جائے اور باقی تمام مضامین اس کے وسیلے سے پڑھائے جائیں۔ ان تصوّرات پر کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ اب تک جامعہ ملیہ میں تعلیم، تربیت، دست کاری اور قومی تصوّرات کے امتزاج کا کام کسی حد تک کیا جاتا رہا تھا۔ خود

ذاکر صاحب نے ان مباحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ کوئی نیا تصور نہیں اور دنیا کے دوسرے ممالک میں اس کا تجربہ کیا جا چکا ہے لیکن ساتھ ہی انہوں نے کھل کر اس تصور سے بھی اپنے اختلافات کا اظہار کیا کہ طالب علموں کی دست کاری پیداوار کو آمدنی کا ذریعہ بنایا جائے اور اس سے مدرسے کے اخراجات کی کفالت کی جائے۔ ان کی اس مخالف رائے کو بھی توجہ کے ساتھ سنا گیا اور بالآخر انھیں کی صدارت میں ایک کمیٹی بنادی گئی کہ وہ کانفرنس کے مباحث اور تجاویز کی روشنی میں بنیادی تعلیم کی اسکیم تیار کردے۔ دسمبر ۳۷ء میں ایک مربوط اور جامع اسکیم پیش کردی گئی۔ اس اسکیم کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیمی معاملات میں ان کا ذہن کتنا صاف اور نگاہ کتنی گہری ہے۔ یہ اسکیم چار بنیادی تصورات پر مبنی اور پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ بنیادی تصورات یہ ہیں:

۱۔ ابتدائی لازمی تعلیم کی مدت سات سال ہو۔

۲۔ تعلیم مادری زبان میں ہو۔

۳۔ کوئی ایک دست کاری تعلیم کی بنیاد بنے۔

۴۔ اسکولی بچوں کے تیار کردہ مال سے اسکول کا خرچ پورا ہو۔

ابتدائیہ میں اس اسکیم کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے کہ اس نظامِ تعلیم میں: (۱) بچے ہاتھ اور دماغ دونوں کے ذریعہ کام کرنا سیکھ لیں گے۔ (۲) طبقاتی اور ذات پات کی تفریق ختم ہوگی (۳) قومی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ (۴) کام کے ذریعہ تعلیم سے بچوں کا علم ٹھوس ہوگا اور (۵) بچوں میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہوگا اور وہ مل جل کر کام کرنے کے عادی ہو جائیں گے۔

اس اسکیم پر ہر طرف سے اعتراضات ہوئے۔ ذاکر صاحب اس کے پرجوش وکیل بن گئے۔ اپنے چھوٹے پیمانے کے تجربے کو وہ قومی سطح پر بروئے کار آتا دیکھ رہے تھے۔ اس لیے جی جان سے اس کی تائید کر رہے تھے۔ بقول پروفیسر محمد مجیب ان کا ڈیڑھ سال "بنیادی تعلیم کے اصولوں کی تشریح وتوضیح اور ان کے اطلاق

کے معاملے میں رہنمائی کرتے کرتے گزر گیا۔[1] مارچ ۱۹۲۸ء کے رسالہ "جامعہ" میں انھوں نے تمام اعتراضات کو سمیٹ کر اس اسکیم کے بارے میں وضاحتیں کیں۔ ان وضاحتوں سے ذاکر صاحب کے دلی رجحانات اور تعلیم کے بارے میں ان کے نظریات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ بچوں کی ذہنی تہذیب اسی وقت ممکن ہے جب تعلیم اُن کے رجحانات کے مطابق ہو:

"جو فرد نظری طبیعت رکھتا ہو، اس کے لیے اپنی قوم یا کُل نوعِ انسانی کے تہذیبی خزانے کی کنجی نظری تعلیم کے سوا اور کوئی چیز نہیں، لیکن اگر کسی عملی طبیعت کے نوجوان کو جو کسی خاص صنعت سے مناسبت رکھتا ہے، اس کی مرضی کے خلاف نظری یا جمالی تعلیم دی جاتے تو اس پر تہذیبی زندگی کا دروازہ نہیں کھل سکتا ہے۔[2]

بنیادی تعلیم کی اسکیم میں دست کاری کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی اور پیشہ ورانہ عملی تعلیم کو تعمیرِ شخصیت کا وسیلہ قرار دیا گیا تھا۔ ذاکر صاحب لکھتے ہیں:

"بارہ تیرہ سال کی عمر سے پہلے بچوں کے رجحانات زیادہ تر عملی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کے ذریعہ سے سوچتے ہیں اور کرنے کے ذریعے سے سیکھتے ہیں۔ گویا وہ نوعِ انسانی کی تاریخ کو دہراتے ہیں۔ اس لیے کہ حقیقت میں دماغ کا کام رفتہ رفتہ ہاتھ ہی کے کام سے پیدا ہوا ہے۔ ہاتھ کا کام نہ صرف کل فنون کی بلکہ کل علوم کی بھی بنیاد ہے۔۔۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی مفید ہاتھ کا کام یعنی کوئی صنعت بچے کی تعلیم کا مرکز قرار دی جائے۔"[3]

---

[1]: محمد مجیب: ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۱۲۱ [2]: جامعہ مارچ ۲۸ء ص ۲۳۷

[3]: جامعہ مارچ ۲۸ء ص ۲۳۷

انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں اس پر زور دیا کہ ہمارے "کتابی مدرسوں" کو "کامی مدرسوں" میں تبدیل ہو جانا چاہیے۔ شوق کے ساتھ اور سمجھ بوجھ کر ہاتھ کا کام کرنے سے بچے کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا اور اس طرح اس کی ذہنی اُپج، تخلیقی صلاحیت اور فطری جوش بڑھے گا اور اس کی شخصیت کی صحیح نشوونما ہو سکے گی۔ وہ یہاں "خود زور فعالیت" "آزاد عمل" اور "بے قید نشوونما" کے خطرات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ وہ صرف ایسے مشاغل کو تعلیمی کہتے ہیں جو ایک معروضی مقصد رکھتے ہوں۔ ان کے الفاظ میں :-

"معروضیت ہر سچے تعلیمی عمل کی خصوصیت ہے۔ محض تفریحی، فعالیت، جو محض بے مقصد ہو یا اس کے مقصد کا تعین نہ کیا جائے، تعلیمی معنی میں فعالیت نہیں کہی جا سکتی ہے"[1]

ذاکر صاحب نے ایک عمر بچوں کے ساتھ گزاری تھی، ان کی نفسیات کو سمجھا تھا۔ اُن کی دلچسپیوں اور خوشیوں میں شریک رہے تھے۔ اُن کی تعلیمی سرگرمی کا اُن کو بخوبی اندازہ تھا۔ عمر کی مختلف منزلوں میں جو تبدیلیاں بچوں میں واقع ہوتی ہیں، وہ ان سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے اس پر توجہ کی گئی کہ بچہ بنیادی تعلیم کس عمر تک ختم کرلے۔ اور نتیجہ میں عملی طفلانہ شوق کی حد بارہ چودہ برس قرار دی گئی "جہاں بچوں کے قوائے ذہنی میں تفریق شروع ہو جاتی ہے اور اسی وقت انھیں آئندہ تعلیم اور پیشہ کے متعلق مفید مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ اسی وقت اُن کے عنفوانِ شباب کے رجحانات اور دلچسپیوں پر اثر ڈالا جا سکتا ہے"[2]

غرض کہ انھوں نے گفتگو میں، تقریریں، تحریر میں اس اسکیم کی بھرپور وکالت کی، اور اس کے ذیل میں اُن کے بہت سے تعلیمی تصورات واضح ہو کر سامنے آگئے۔ اس وقت کے ایجوکیشن کمشنر سر جان سارجنٹ نے اس کو Scheme DYNAMIC

---

[1] : جامعہ مارچ ۱۹۳۸ء، ص ۲۲۹ (۲) جامعہ مارچ ۱۹۳۸ء، ص ۲۴۰

سے تعبیر کیا تھا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مجوزہ نظامِ تعلیم افسر شاہی کی خود غرضیوں اور ہمارے نظام سے ہماری ناروا محبت کا شکار ہو کر رہ گیا اور اس کا نہ پوری طرح نفاذ ہو سکا اور نہ اس کے حقیقی نتائج سامنے آسکے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ۱۹۸۶ء کی نئی تعلیمی پالیسی میں اس اسکیم کی بعض باتوں کو سمو لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نتیجے کے لیے ابھی انتظار کرنا ہوگا۔

صرف یہ نہیں کہ ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کی ایک ایثار پیشہ مخلص جماعت کی تعلیمی منصوبہ بندی میں عملی رہنمائی کی، صرف یہ نہیں کہ انھوں نے جامعہ ملیہ کی شکل میں ایک مثالی تعلیم گاہ کو وجود بخشنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا، صرف یہ بھی نہیں کہ انھوں نے گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کے مبہم سے تصور کو ایک مرتب نظامِ تعلیم کی شکل دی اور بعد میں اس کی وکالت کرتے رہے، بلکہ انھوں نے اپنے تعلیمی تصورات کو ایک نظریاتی شکل دی۔ وہ اپنے خطبات میں، مقالات میں، ریڈیائی تقریروں میں، غرض کہ ان کو جہاں موقعہ ملا، اپنے خیالات کا پرچار کرتے رہے۔ یہ نظریات ایک آسودہ سوچنے والے ذہن کی ترنگ نہیں تھے بلکہ ان بے تاب تجربوں کا نچوڑ تھے جو ایک خاص مقصد کے تحت جامعہ ملیہ میں کیے جا رہے تھے ـــــ اور یہ بے تابی تھی، ایک نئے سماج کی تعمیر کی، اس سماج کے لیے مثالی شخصیتیں ڈھالنے کی، استخلاصِ وطن کی آرزو کی اور اہلِ وطن میں محبت و رواداری کے تصور کو عام کر دینے کی۔ تجربے کی آنچ میں تپ کر ان کے یہ تصورات منقح ہوتے رہے۔ ان میں پختگی آتی گئی اور ساتھ ہی بلندی بھی پیدا ہوتی گئی۔

ہماری تعلیم گاہوں نے جس طرح کتاب اور معلومات پر زور دیا، اس کے نتیجہ میں تعلیم کا تصور ہی دھندلا گیا۔ بغیر سوچے سمجھے (اور ثانوی تک کم از کم ایسا ہی ہوتا ہے) کچھ معلومات کے ذہن میں محفوظ کر لینے کو تعلیم سمجھ لیا گیا اور تعلیم گاہیں اور معلم طلبا کو یہ معلومات فراہم کر کے سمجھتے ہیں کہ اُن کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ ذاکر صاحب اس تصور کو مسترد کر کے تعلیم کا رشتہ راست سماج سے جوڑتے ہیں:

"تعلیم دراصل کسی سماج کی اس جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے، اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی پیدا کر سکیں[1]۔"

اور پھر اس تعلیم کو تعمیرِ شخصیت کا فرض بھی ادا کرنا چاہیے:

"تعلیم نام ہی اس کا ہے کہ متعلّم کے کُل قواے جسمانی و ذہنی کی تربیت کر کے ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اسے تمدّنی زندگی کے کل شعبوں کا محرم بنا کر اس میں اپنی استعداد کے مطابق حصّہ لینے کے لیے تیار کیا جائے، لہٰذا تعلیمی نظام کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے کہ جماعت کے سامنے کوئی تمدّنی نصب العین ہو[2]۔"

جس جماعت کے سامنے کوئی تمدّنی نصب العین ہوگا، وہ اس کے بقا اور استحکام کے لیے اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا اس طرح انتظام کرے گی کہ فرد کے ذہن کی پوری پوری پرورش ہو جائے۔ اس کی ذہنی ترقی کا جتنا امکان ہو، وہ اُسے حاصل کرلے، لیکن یہ ترقی صرف انفرادی ہو تو اس سے اجتماعی مفید نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ اس لیے:

"جب ثانوی منزل میں طالبِ علم کے ذہن میں تفریق پیدا ہو تو اس کی ذہنی نشو و نما ان اشیائے تمدّنی کے ذریعہ کی جائے جو اس کی مخصوص ذہنی ساخت اور فطری صلاحیتوں کے مطابق اور مناسب ہوں[3]۔"

اس طرح تعلیم کے ذریعہ نہ صرف نئے ذہنوں کی ساخت و پرداخت ہوتی رہتی ہے، بلکہ سماجی ذہن کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے۔ یہ عمل کس طرح ہوتا ہے۔ اس کو بھی ذاکر صاحب کی زبانی سنیے:

"تمدن کی گوناگوں چیزیں کہ یہ خود ذہنِ انسانی کی تخلیقات ہوتی ہیں، ان میں ذہنِ انسانی اپنی توانائیوں کو محفوظ کر دیتا ہے۔ جب کوئی

---

[1] ذاکر حسین: تعلیمی خطبات ص۱۰۱ [2] ذاکر حسین۔ تعلیمی خطبات ص۳۹

[3]: ذاکر حسین، تعلیمی خطبات ص۱۹

نیا ذہن انھیں اپنے اندر لیتا ہے، انھیں اپناتا ہے تو یہ توانائیاں پھر سے ابھر کر اس نئے ذہن کی تربیت کا کام کرتی ہیں[1]۔"

اس تربیتِ ذہنی کا مطلب یہ نہیں کہ معلّم طالبِ علم کی انگلی پکڑ کر چلائے اور ہر ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرے، بلکہ صحیح تعلیم کا وظیفہ یہ ہے کہ عقل و شعور کو پختگی بخشے۔ جس کے ذریعہ فرد خود اپنی راہیں تلاش کرلے۔ ذاکر صاحب کے الفاظ میں:

"تعلیم کا پہلا کام یہ ہے کہ صحیح مشاہدے کی صلاحیت پیدا کرے اس کے دھوکوں سے بچنے اور صحیح مشاہدوں سے صحیح نتیجوں پر پہنچنے کی مشق کرائے۔ ٹھیک دیکھ سکنا اور منطقی طور پر سوچ سکنا سکھا دیجیے تو آپ نے تعلیم کا تین چوتھائی کام کردیا[2]۔"

فکرِ انسانی ذہنی شکل تک محدود رہے تو اس میں بھٹکنے کا امکان بھی رہتا ہے اور دھوکے کا بھی، لیکن عملی شکل اختیار کرلینے کے بعد مشاہدے کے ذریعہ اس کی صحت و عدم صحت کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اسی لیے جامعہ ملیّہ میں ابتدائی درجات سے ہی بچوں کو مختلف عملی کاموں سے روشناس کرایا جاتا۔ ان کو ذمہ داریاں دی جاتیں، تاکہ معلّمین کی نگرانی میں وہ خود بہت سی باتوں کے تجربے کرلیں اور ان کی شخصی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقعہ ملے اور ہر بچے میں شخصیت کی تکمیل کے جو ان گنت امکانات ہیں، ان میں سے کسی ایک کی یا کچھ کی پرورش ہوجائے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ:

"تجربے سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار ۔۔۔ ۔۔۔ ذہن کو تربیت دیتا ہے، روح کی پرورش کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے۔ یہی حال میکانکی ہنرمندی کے مقابلے

---

[1]: ذاکر حسین، تعلیمی خطبات ص۲۷۹

[2]: ذاکر حسین، تعلیمی خطبات ص۷۶

میں تخلیقی ہنرمندی کا ہے۔[1]

یہیں سے فرد کی وہ سیرت بنتی ہے جو اُسے اگر ایک طرف سماجی بہبود کا ذریعہ بناتی ہے تو دوسری طرف معاشِ زندگی میں نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیتی ہے۔ اگر یہ سیرت سازی نہ ہو تو ہر نظامِ تعلیم اور تمام تعلیم گاہیں بے سود ہیں مگر دورِ غلامی میں اور آج بھی کہ آزادی کے چار عشرے گزر چکے ہیں، ہمارے تعلیمی اداروں نے سیرت سازی پر کوئی توجہ نہیں کی۔ صرف معلومات کو علم اور تعلیم کا وظیفہ سمجھ لیا گیا۔ مستقبل کے مدرسوں کا جو تصوّر ذاکر صاحب کے ذہن میں تھا۔ اس میں سیرت کی تربیت کو ہر چیز پر ترجیح حاصل تھی۔ اپنے اس خواب کو انھوں نے کبھی (   ) ان الفاظ میں بیان کیا:

"ہمارے یہ نئے مدرسے نوجوانوں کی خودمختار آبادیاں ہوں گے جن میں نئی نسل اپنی جماعتی زندگی کی تشکیل کا علمی تجربہ حاصل کرے گی اور ایک آزاد قوم کے نوجوان آزادی کو قائم رکھنے اور برتنے اور ترقی دینے کے لیے تیار ہوں گے۔[2]"

اس سیرت کی انھوں نے پھر یہ توضیح کی:

"ایک مسلمان تعلیمی کام کرنے والے کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی نظام کے بنانے میں سب سے اہم اصول یہ پیشِ نظر ہونا چاہیے کہ متعلّم کی خداداد صلاحیتیں درجۂ کمال کو پہنچیں، پوری طرح نشوونما پائیں۔ اس کی انفرادیت میں یک جہتی پیدا ہو اور اس سے ایک یکسو سیرت بنے، اور یہ یکسو سیرت اعلا اخلاقی اقدار کی خادم بن کر شخصیت کے مرتبۂ بلند کو پہنچ سکے۔ انفرادیت سے سیرت، سیرت سے اخلاقی شخصیت ـــ صحیح تعلیم کا یہی راستہ مجھے اسلامی راستہ معلوم ہوتا ہے۔[3]"

یہ اخلاقی شخصیت بنے گی ہاتھ سے کام کرنے میں، اپنے من پسند کام کو اختیار کرنے میں، رل مل کر کام کو انجام دینے اور زندگی بسر کرنے میں، کام کو کسی اعلا مقصد کے

---

[1] : ذاکر حسین : تعلیمی خطبات ص ۱۰۴

[2] : ذاکر حسین : تعلیمی خطبات ص ۵۵

[3] ، ، ، ص ۲۴۹

ساتھ جوڑتے اور اس کو نصب العین بنا لینے میں۔ وہ آرزومند ہیں تو اس بات کے لیے کہ ہماری آئندہ نسلوں کی تربیت انھیں اثرات کے تحت ہو۔ یہ کام "کتابی مدرسوں" میں نہیں ہو سکتا۔ صرف "کامی مدرسوں" میں انجام پا سکتا ہے۔ بنیادی تعلیمی کانفرنس کے خطبہ میں انھوں نے کہا:

"تعلیمی کام وہی ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت کرے جو ہماری خود غرضی سے پرے ہو۔ اور جسے ہم ملتے ہوں۔ جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنر مند ضرور ہو جاتا ہے مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا، جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کام کا حق ادا کرتا ہے، اپنا مزہ نہیں ڈھونڈھتا[1]"

غرض جتنا ہم ان کے خیالات کو اور اُن کے عملی تجربوں کو دیکھیں، اتنا ہی ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم گاہوں کی مروّجہ کتابی تعلیم کو نہایت ناقص قرار دیتے ہیں۔ تعلیم کو وہ دست کاری کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں۔ تعلیم اُن کے نزدیک ایک سماجی اور قدر نہاد عمل ہے، جس کے ذریعہ ہم مل جُل کر کام کرنا، تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا، تنگ نظری اور خود غرضیوں کو ترک کر دینا، اعلا اقدارِ حیات پر یقین کرنا سیکھتے ہیں۔ اس تعلیم کے ذریعہ وہ بچے کی بھرپور اور توانا شخصیت کی نشوونما ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں ـــ ایسی شخصیت جو ہر اعلا انسانی معیار پر پوری اُترے اور دُکھوں سے بھری ہوئی خدا کی اس وسیع دنیا کے لیے رحمت بن جائے۔ ❊ ❊ ❊

---

[1] ذاکر حسین۔ تعلیمی خطبات ص ۹۷

عبد الحق خاں

ذاکر صاحب ـ ایک معلّم

ذاکر صاحب کی شخصیت اِس قدر ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے کہ اُس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اُن کی حیثیت ماہرِ تعلیم، ماہرِ اقتصادیات اور معلّم و مفکر کی بھی ہے اور ایک اچھے سیاست داں کے اوصاف بھی اُن کی شخصیت کے تار و پود میں نظر آتے ہیں۔ ان متنوّع حیثیتوں اور صلاحیتوں میں جوہرِ اصلی کی تلاش خاصا دقّت طلب مسئلہ ہے۔ لیکن ذرا غور کیجیے تو ان کی زندگی کا نصب العین اور اُن کا میلانِ طبع اس وادیِ دشوار سے نکال کر ہماری راہنمائی راہِ مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ انھوں نے جرمنی سے اقتصادیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی تھی، وہ بڑی آسانی سے حکومت کے اعلا منصب پر فائز ہو سکتے تھے۔ لیکن ذاکر صاحب نے ایسا نہیں کیا بلکہ معلّمی کی عُسرت اور تنگی کی زندگی کو اُس عیش و عشرت پر ترجیح دی اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے قومی و ملّی کام میں تن من دھن سے جٹ گئے۔ اِس قربانی کے پس پشت جس جذبہ کی کارفرمائی تھی وہ ایک ایسے معاشرے کے قیام کا جذبہ تھا جو ایسے افراد پیدا کرے جن کی زندگیاں انسانیت کے اعلا مقاصد کی ترویج و اشاعت میں معاون ہوں۔

ذاکر صاحب افراد کی تربیت اس انداز سے کرنا چاہتے تھے کہ وہ اچھے ہندوستانی اور اچھے مسلم یا ہندو بن سکیں۔ اس کارِ مشکل کے لیے اُن کی نظرِ انتخاب "اساتذہ" پر پڑی اس طرح ان کی آرزو کا محور ایک "اچھا معلّم" ٹھہرا، جس کے وجود سے قوم کی کھیتی نہ صرف برگ و بار لائے بلکہ اُس کے نونہال "نشانِ منزل و راہ" ہوں۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے

جس 'ریاست' کی بنیاد ڈالی اُس میں سب سے اہم مقام 'استاد' کا ہے۔ اِسی اہمیت کے پیشِ نظر وہ 'استاد' میں اُن عناصر کو تلاش کرتے ہیں جو محبت، ایثار اور اقدار صالح کی پرورش و پرداخت میں فعال اور مثبت کردار ادا کریں۔ اُن کا قول[1] ہے:

"استاد کی کتابِ زندگی کے سرورق پر "علم" نہیں لکھا ہوتا "محبت" کا عنوان ہوتا ہے۔ اُسے انسان سے محبت ہوتی ہے، ان ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں۔ ان میں جہاں تک اور جس اسلوب سے ان خوبیوں کی تکمیل کا سامان ہے، یہ اس میں مدد دیتا ہے، اسی کام میں اپنے دل کے لیے راحت اور اپنی روح کے لیے تسکین پاتا ہے۔"

ایک اور جگہ اپنے خیالات کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں:

"جی ہاں! بچہ ہوں اور مرتے دم تک بچہ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ تمہیں کیا بتاؤں دل کو اِس میں کیسی راحت ملتی ہے کہ آدمی ذرا ذرا بچہ بھی ہو، یقین کر سکے، بھروسہ کر سکے، محبت کر سکے، غلطی ہو جائے بھول چوک ہو، حماقت ہو تو ان سے لوٹ آئے اور آپ کے سارے عقل مند لفنگوں سے زیادہ بھولا، زیادہ اچھا اور آخر میں چل کر زیادہ عقل مند بھی نکلے۔ جنابِ عالی، اِس کے خلاف بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سنا، مگر پھر بھی اِس میں بڑا مزہ ہے کہ آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے، روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے اور عقل مندوں کو اور بے وقوفوں کو کہ دونوں گم راہ ہوتے ہیں، معاف کرے۔"

اِن سیدھے اور دو ٹوک جملوں میں ایک اچھے اور سچے معلم کی روح صاف جھلکتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہے۔ ذاکر صاحب کو جو لوگ قریب سے جانتے ہیں انھیں اس بیان کی صداقت

---

[1] تعلیمی خطبات۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۸۲ ص ۱۵۶

پر شک نہ ہوگا کہ وہ تمام عمر نذر انداپنے سے رہے۔ یقین کرتے رہے، محبت کرتے رہے عقل مند اور بے وقوفوں دونوں کو معاف کرتے رہے۔ انھوں نے صرف معاف کرنے پر ہی بس نہ کی بلکہ ان گمراہ لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے معلمانہ کوششیں بھی کیں۔ جامعہ میں بعض ایسے افراد بھی تھے جو مڈل اسکول میں معلّم تھے لیکن یونیورسٹی بھیج دیے گئے تھے وجہ صرف یہ تھی کہ ذاکر صاحب انھیں پتا نوری کے عقل مند یا بے وقوف لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ اب یہ اللہ کو معلوم ہے یا ذاکر صاحب جانتے تھے کہ وہ عقل مند لوگ تھے یا بے وقوف۔

ذاکر صاحب کو فیاضِ ازل نے ایک معلّم کا قلب و دماغ عطا کیا تھا۔ وہ ہر حال میں اور ہر موقع پر صرف اور صرف معلّم نظر آتے ہیں۔ زندگی کا کوئی میدان ہو اُن کی خلقی شانِ معلمی اپنا جلوہ ضرور دکھاتی ہے۔ وہ اپنے مشن کو علی گڑھ، کاشی ودیا پیٹھ اور ایوانِ حکومت تک یکساں قوت و استحکام کے ساتھ جاری رکھتے ہیں۔ سیاست کی پر پیچ وادیوں میں جہاں اقدارِ صالح اور خلوصِ نیت کی کوئی خاص وقعت نہیں، جہاں ہر چیز کی پرکھ اور کسوٹی صرف ووٹ ہے، ذاکر صاحب علم کی شمع کو برابر فروزاں رکھنے کی کوشش میں لگے رہے۔ انھوں نے راجیہ سبھا کے چیرمین کی حیثیت سے جو جوابی تقریر کی اس کا ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے:

> "جب مجھے پہلی بار علم ہوا کہ اِس عظیم منصب کے لیے میرا نام زیرِ غور ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی اور اُس کا سبب معلوم کرنے کے لیے اپنے آپ کو بہ آسانی قائل نہ کر سکا۔ لیکن جب میرے انتخاب کے بعد مجھے جو ہزاروں خط اور تار موصول ہوئے ان سے مجھے کچھ اندازہ ہوا کیونکہ ان بھیجنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل تھی جو معلّم تھے ملک کے دور دراز گوشوں میں پرائمری سطح کے مدرس تھے، ہائی اسکول اور یونیورسٹی کے اساتذہ تھے۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس اعزاز کا مستحق اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ میں تعلیمی کام میں منہمک رہا ہوں اور اس اہمیت کا احساس بھی ہوا جو ہمارے لوگ صحیح طور پر اپنی زندگی میں تعلیم کو دیتے ہیں۔ یقیناً تعلیم ہی ہماری جمہوری

زندگی کی اساس ہے۔ ہمارے قدیم اور جدید لوگ تعلیم کو اپنی زندگی کی تشکیل کے سلسلے کی اہم قوت سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ تعلیم ہی کے ذریعہ ہم اپنے علیم ورثہ کا تنقیدی جائزہ لے سکتے ہیں، ہم اس ورثہ میں امتیاز کر سکتے ہیں جو معاون ثابت ہو اور وہ جو مزاحم...... اصل میں تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جو ہمیں اس مستقبل کا نظارہ کرا سکتی ہے جس کے حصول کے لیے ہم کوشاں ہیں اور جس کی تشکیل کے سلسلے میں ہمیں ذہنی اور اخلاقی توانائی حاصل ہوتی ہے۔
... ہماری زندگی میں تعلیمی کردار کا یہی نظریہ اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ آپ نے نائب صدر اور راجیہ سبھا کے چیئرمین کی حیثیت سے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جس نے ایک اسکول کا مدرس ہونے کے علاوہ اب تک کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ میں اپنی ذاتی حدود سے واقف ہونے کے باوجود خوش ہوں کہ میرے لوگ قومی زندگی میں تعلیم کے کردار کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔[1]

یہ قدرے طویل اقتباس محض اس لیے نقل کیا گیا تاکہ ذاکر صاحب کی رائے تعلیم اور معلم کے بارے میں واضح طور پر سامنے آ جائے۔ اس اقتباس سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ وہ نائب صدر اور صدر کے عہدوں کو ایک معلم کے سفر سے تعبیر کرتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کے نظریات پر افلاطون کا گہرا اثر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ذاکر صاحب افلاطون کے نظریات سے اس وقت متاثر ہوئے ہوں جب وہ افلاطون کی State کا ترجمہ کر رہے تھے۔ لیکن ان کی فکر کے سرچشمے تو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کے پروردہ ہیں۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو منظم اور منضبط کر کے انسانیت کے اس کارواں سالار کی اتباع شروع کر دی جو ساری انسانیت کے لیے شمعِ ہدایت بن کر آیا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایک اچھے مسلمان اور سچے معلم کی طرح اپنی فکر و عمل کے چراغ ہندوستان کی کسی ایک قوم ایک ادارے یا مخصوص طبقے کے لیے

---

[1] تعلیمی خطبات ص

روشن نہیں کیے بلکہ ملک اور قوم کے ہر فرد کے لیے اپنے ذہن و دل کے دروازے کھلے رکھے۔ کاشی ودّیا پیٹھ کے "سناتکوں" کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"کاشی ودّیا پیٹھ کے سناتک ہو کر تم کبھی اپنی قوم کی راہ میں روک نہ بننا، اپنی کامیابی کے لیے بہتیرے لوگ قوم کا نقصان کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ تم اس کا دھیان رکھنا کہ کامیابی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنے فرائض کو ترک کر کے اور اپنی ساری اچھی خواہشوں کو پیروں تلے روند کر ہی اس تک پہنچا جائے۔ جو اپنی غرض کے لیے اتنا اندھا ہو جائے کہ اپنے دیس اور قوم کو نقصان پہنچانے سے بھی نہ چوکے، وہ آدمی نہیں جانور ہے۔ اور اگر کاشی ودّیا پیٹھ میں پڑھے ہوئے ہونے کی وجہ سے تم اپنی زندگی دیس سوا میں لگانا چاہتے ہو تو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔

تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا بدنصیب ملک ہے۔ وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بے انصافیوں کا ملک ہے، بے رحمیوں کا ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے... بھوک اور مصیبت کا ملک ہے۔ غرض بڑا کمبخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجیے، تمہارا اور ہمارا ملک ہے، اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے۔ اسی لیے یہ ملک تمہاری ہمتوں کے امتحان، تمہاری قوتوں کے استعمال اور تمہاری محبّت کی آزمائش کی جگہ ہے۔"[1]

کاشی ودّیا پیٹھ کے طلبا کو قوم و ملت کا درد سکھانے والا یہ شخص نہ سیاسی لیڈر ہے اور نہ ہی کوئی دانشور، جذبہ کا یہ وفور اور دل کی تڑپ کہہ رہی ہے کہ اس پیغام کا داعی معلّمِ اخلاق اور انسانیت نواز معلّم ہی ہو سکتا ہے۔ وہی شخص ہو سکتا ہے جو وطن کے صحراؤں کو بھی لالہ زار

---

[1] تعلیمی خطبات ص ۲۹ تا ۳۰

بنانا چاہتا ہے جس کا گھر سارا ہندوستان ہے اور جس کا کنبہ سارے دیس واسی۔

ذاکر صاحب بنیادی طور پر حریت پسند اور فقیر منش انسان تھے۔ لیکن ان کی فقیری میں بھی شانِ سلطانی تھی۔ "اللہُ جمیلٌ وَ یحبُّ الجمال" کے پیرو تھے۔ فنونِ لطیفہ میں مصوری اور خطاطی میں خاص ذوق تھا۔ شاعری کے دلدادہ تھے ہی۔ رومی، حافظ، خسرو، سعدی، اقبال ان کے پسندیدہ شعراء تھے۔ لیکن ان کی ذہنی تربیت میں معاشیات کو بھی کافی دخل تھا۔ یہی سبب ہے کہ بہ حیثیت معلّم طلبار کی ذہنی تربیت کے لیے انھوں نے عالم اسباب کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ جامعہ جب قرول باغ میں تھی تو حالی کی یہ رباعی۔

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر سانس کو نقشِ جاودانی سمجھو

اور اقبال کا یہ شعر

ما زِ تخلیق مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

ہر دیوار پر چسپاں کروا دیا تھا۔ ان اشعار کی فعالیت اور پیغامِ فکر و عمل اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ذاکر صاحب نوجوان نسل کی تربیت کس نہج پر کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ ذاکر صاحب بنیادی طور پر حریت پسند اور فقیر منش انسان تھے۔ یہ ان کی زندگی کا دوسرا رُخ تھا جس کا سراغ ہمیں ان کی گھریلو زندگی اور انتخابِ اشعار میں ملتا ہے۔ ان کی ذاتی ڈائری میں جہاں رومی، سعدی، حافظ کا کلام ہے وہیں علامہ اقبال کی مشہور نظم مسجد قرطبہ کے یہ اشعار بھی درج ہیں۔ جنھیں بقول پروفیسر مسعود حسین وہ بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں کار کُشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

ذاکر صاحب کے شعروں کے انتخاب نے انھیں سمجھنے میں مدد کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا روم

اور اقبالؔ دونوں کے افکار و عزائم کو ایک تسلسل کے ساتھ ذاکر صاحب نے اپنی زندگی میں برتا۔ "انسانم آرزوست" اور "بندۂ مولیٰ صفات" کی غرض و غایت کو شاید ان کے ذراک ذہن نے پالیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ تمام عمر تلاشِ حسن و صداقت میں سرگرداں رہے۔ سیاست کے ریگ زار میں بھی وہ تعلیم کے میٹھے چشموں کو نکالنے کے لیے کوشاں رہے۔ کہیں کام یاب ہوئے کہیں ناکام لیکن ہمّت نہ ہاری۔ تعلیم اور انسانیت کے اعلا نصب العین کا پرچار مدرسوں، یونیورسٹیوں میں کیا تو کبھی ملک اور ملّت کے ان اجتماعات میں سرگرمِ سخن ہوئے جہاں ان کی آواز کے معنی شناس موجود ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ انھیں کے کلمات پر اپنی بات ختم کروں۔ مجھے بار بار ذاکر صاحب کا وہ خطبہ یاد آرہا ہے جو انھوں نے جامعہ کے جشنِ سیمیں کے موقع پر دیا تھا۔ پورا خطبہ اس لائق ہے کہ بار بار پڑھا جائے لیکن میں صرف خطبہ کے ان الفاظ کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں:

"تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا میدانی دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا، بلکہ گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ سیاست استحکامِ وجودِ قومی کی تمنا ہے، فطرتاً بے تاب۔ تعلیم اقدارِ مطلقہ کی عاشق ہے، لازماً صبر طلب۔ تعلیم ان اعلا اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی ہے اور پیدا کرتی ہے، سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت، اس لیے وہ مخدوم ہے یہ خادم۔ سیاست شدّت چاہتی ہے، تعلیم مدّت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلا کرتے ہیں تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لیے نہیں ہے راہ رو کا رُخ متعین کرتی ہے:

ملالِ عالمیاں دم بہ دم دِگرگوں است
منم کہ مدّتِ عمرم بیک ملال گزشت

٭

تعلیمی خطبات ص ۲۵

سلیمان اطہر جاوید

ذاکر صاحب۔ تعلیمی خطبات کے آئینے میں

ابتدائی زندگی میں یونانی طب کی کتابیں پڑھیں اور غالباً بننا چاہتے تھے طبیب۔ کالج میں طلبہ کی قیادت کرتے رہے۔ بعد میں معاشیات کی اعلا تعلیم حاصل کی اور پھر سیاست کے لیے اپنے آپ کو وقف سا کر دیا کہ ملک کے اعلا ترین منصب جمہوریۂ ہند کی صدارت پر فائز ہوئے ——— ذاکر صاحب، اور بھی رہینِ ستم ہائے روزگار رہے ہوں لیکن تعلیم کے خیال سے کبھی غافل نہ رہے اور یہی آخر کو گویا اُن کا فن ٹھہرا۔

تعلیم، ذاکر صاحب کے نزدیک صرف تعلیم محض نہ رہی بلکہ وہ تعلیم کا ایک اعلا، وقیع، ہمہ گیر، دور رس اور زندگی دوست تصوّر رکھتے تھے۔ تصوّر ہی نہیں تعلیم اُن کے لیے ایک عملی اور سماجی عملی پہلو بھی رکھتی تھی بلکہ سماجی عملی پہلو ہی! مقصدیت اور افادیت کا حامل!۔ اگر ہمارے تعلیمی نظام میں ادارے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لیے قائم ہوا کریں تو ان میں تعلیم یافتہ افراد کو ذاکر صاحب نے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیمِ اسناد مورخہ ۱۴ اگست سنہ ۱۹۳۵ء میں "چلتے پھرتے کتب خانے" سے موسوم کیا ہے۔

یہ جو آج نئے نئے تعلیمی تصورات اور اسکیمیں ہمارے سامنے آ رہی ہیں اُن کا معروضی انداز میں جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ذاکر صاحب نے بنیادی طریقۂ تعلیم

کو واضح کرنے کے لیے اپنی جو رپورٹ ۱۹۳۷ء میں پیش کی تھی اور پھر اس کے بعد انھوں نے مختلف مواقع پر جو تعلیمی خطبات دیے اُن میں ان تصورات اور اسکیموں کا وہ کسی نہ کسی انداز میں احاطہ کر چکے تھے۔ ذاکر صاحب کے نزدیک:

"تعلیم، بس کچھ رٹ لینے یا چند باتیں جان جانے کا نام تو نہیں بلکہ تعلیم اُسے کہتے ہیں کہ آدمی جو دماغی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے اس میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اُسے حاصل کرے۔ تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے۔"[1]

اور اسی خطبہ میں وہ یہ بھی کہہ چکے ہیں:

"تعلیم دراصل کسی سماج کی جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اُس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں مناسب اور ضروری تبدیلی کر سکیں۔"[2]

تعلیم کے بارے میں یہ اور ایسے نکھرے ستھرے خیالات کا ذاکر صاحب نے جا بجا اظہار کیا ہے۔ اِس طرح ذاکر صاحب نے تعلیم کو صرف برائے تعلیم نہیں رکھا کہ فرد اس کو رٹ لے اور تعلیم کا تعلق بس آنکھوں اور زبان سے رہے۔ اس نوع کی تعلیم کا نتیجہ وہی ہو سکتا ہے جو کہ ہوتا آیا ہے۔ طالبِ علم ایسے "علم" کو (اگر اس کو "علم" کہا جائے تو) کلاس روم سے امتحان ہال تک اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اِدھر سند ملی کہ علم رخصت! ــــ اور یہ وہ علم ہے جو سچ پوچھیے تو "علم" کے لیے نہیں صرف ملازمت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ ذاکر صاحب نے موخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء یونیورسٹی آف جموں و کشمیر کے کنووکیشن کو مخاطب کرتے ہوئے

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین "تعلیمی خطبات"، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ جولائی ۱۹۶۱ء۔ پانچویں بار ص ۱۹

[2] ایضاً ص ۱۸

ایسی تعلیم کو جو سند اور ملازمت کے لیے حاصل کی جاتی ہے زندگی سے سودے بازی قرار دیا ہے، ایک اچھی سودے بازی جس میں آپ دیتے کم اور حاصل زیادہ کرتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ کوئی ایسا نہیں جو آپ سے مواخذہ کرے، نہ خدا، نہ ضمیر نہ استاد، نہ رائے عامہ ــــ بگڑا خط، خراب گرامر، روز مرہ اور محاورے کا فقدان۔ ہاں کچھ نوٹس رٹ لیے کہ امتحان میں پوچھے جانے والے آٹھ دس سوالات کے کام آجائیں اور یہ سب اس لیے کہ ایک سند مل جائے اور جب سند مل جاتی ہے تو ملازمت کے لیے دوسرے سے زیادہ دوڑ دھوپ شروع۔ اور جب اپنی تیزی نہیں چلتی تو اوروں کا اثر ورسوخ کام میں لایا جاتا ہے پھر جب ملازمت مل جاتی ہے تو کوشش یہ دکھانے کی ہوتی ہے کہ ہم ہی اس کے مستحق تھے اور اسی کے ساتھ کسی اور اچھی ملازمت کے لیے ہاتھ پیر مارے جاتے ہیں۔ اثر ورسوخ کا پھر استعمال ہوتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے ــــ ظاہر ہے یہ کیسا اور کہاں کا علم! ذاکر صاحب نے ایسی تعلیم کی شدت سے مخالفت کی ہے لیکن اس اعلا سطح پر اصلاح ناممکن نہ بھی ہو، نتیجہ خیز تو ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کا اپنا نظریہ پیش کیا جس میں انھوں نے گاندھی جی اور دیگر کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ــــ

آج بھی ہمارا نصاب، طلبہ کی ضروریات کے مطابق کم اور نصاب تشکیل دینے والوں کی لیاقت کا اظہار زیادہ ہوتا ہے۔ ونیز عملی کم اور نظریاتی زیادہ ــــ انھی وجوہ سے طالبِ علم کی اس میں دلچسپی کم ہوتی ہے کیونکہ اُس کو ایسی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی کہ آنے والی زندگی میں وہ اس سے استفادہ کر پائے گا ــــ صورتِ حال جب یہ ہو تو اس کے لیے زیادہ وقت، زیادہ محنت اور زیادہ توجہ کیوں صرف کی جائے۔ وقتی طور پر رٹ لیں کہ امتحان میں جیسے تیسے کامیابی حاصل ہو اور بس ــــ اسی باعث ذاکر صاحب نے ایک عملی انسان کی حیثیت سے، ایک وہ جس کو قومی تعلیمی مسائل سے دلچسپی بھی رہی اور تعلق بھی، عملی تعلیم پ

آغاز ہی سے زور دیا۔ انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں کہا ہے کہ :

"طالب علمی کے زمانے میں بنیادی چیزیں سکھائیے، فروعات کو چھوڑیے، کم چیزیں سکھائیے اور کتابوں کی جگہ عملی کام کی طرف زیادہ توجہ دیجیے [1]"

لیکن عملی کام کی سمت طالب علم اسی وقت توجہ دے سکتا ہے جب کہ اُس میں مُشاہدے اور صحیح مشاہدے کی صلاحیت پیدا ہو۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے مشاہدے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس پر اصرار کیا ہے کہ ٹھیک دیکھ سکنا اور منطقی طور پر سوچ سکنا اگر بچے کو سکھا دیا جائے تو گویا تعلیم کا تین چوتھائی مقصد پورا ہو گیا۔

عملی کام کے سلسلے میں ذاکر صاحب دستکاریوں پر زور دیتے ہیں تاکہ بچے میں اپنی ذات پر اعتماد پیدا ہو۔ وہ اپنی انفرادی صلاحیتوں کو روبہ کار لا سکے، اس کی شخصیت صحیح خطوط پر تشکیل پائے اور وہ اس جمہوریت کا معزز فرد ثابت ہو۔ ۲۴ فروری ۱۹۴۴ء کو نیو ایجوکیشن فیلوشپ پنجاب کے اجلاس منعقدہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے واضح طور پر کہا،

"ہاتھ کے کام کو مدرسہ میں جگہ دے کر یہ جمہوری جماعت دراصل وہ کام انجام دے گی جو اس کا پہلا تعلیمی مقصد ہو سکتا ہے یعنی کار آمد شہری پیدا کرنا تاکہ جمہوریت کی روح، فرد کا احترام باقی رہے فرد اس طرح کار آمد بنے کہ اپنی انفرادیت کو بھی اُسے تجنا نہ پڑے اور اپنے انفرادی تربیتی امکانات سے بھی محروم نہ ہو جائے [2]"

ذاکر صاحب کے نزدیک طالبِ علم کو اپنی ذات پر اعتماد اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے اور اس کی انفرادی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما اُسی وقت ممکن ہے جب

---

[1] "تعلیمی خطبات"، ص ۸۰ [2] "تعلیمی خطبات" ص ۱۸۶

کہ تعلیم مادری زبان میں ہو۔ انھوں نے اپنے خطبات میں جہاں جہاں بھی اس کا موقع آیا اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی سات سال کی مفت اور لازمی تعلیم پر زور دیتے ہوئے مادری زبان میں خاص طور پر ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم کو از بس ضروری قرار دیا ہے کہ ایسا نہ ہو تو طالب علم کی شخصیت تشکیل نہیں پا سکتی اور اس طرح ایک کار آمد شہری پیدا کرنا کہ جمہوریت کی روح اور فرد کا احترام باقی رہے ممکن نہیں ہوگا۔ اپنے مذکورہ بالا خطبہ میں انھوں نے اس امر پر بھی اصرار کیا ہے کہ :

"خصوصاً تعلیم کا کام کرنے والوں کو اس میں ذرا دیر نہ کرنی چاہیے کہ اپنی راہ سے ایک پردیسی زبان کے ذریعۂ تعلیم دینے کی مصیبت کو ہٹائیں اور ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کے لیے جو کانفرنس یہاں جمع ہے اس کے اراکین کو جاننا چاہیے کہ ان کا سارا کام بچوں میں اور بچوں کے والدین کے ساتھ مادری زبان ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔"[1]

ذاکر صاحب پردیسی زبان ہی کو ہٹانا نہیں چاہتے بلکہ پردیسی کلچر سے بھی وہ دامن بچانا چاہتے ہیں اور ایک ایسے نظامِ تعلیم کے حق میں ہیں جس میں ہماری تہذیب کی آئینہ داری بھی ہو اور جس کی جڑیں ہماری تہذیب کی مٹی میں دیر تک اور دور تک چلی گئی ہوں اور ایسا نظامِ تعلیم جو ہمارے اقتصادی تقاضوں سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہو۔

ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب تعلیم کو صرف فرد کا معاملہ قرار نہیں دیتے۔ فرد، ایک جزو ہے اور سماج کُل، اور ہر جزو کی طرح یہ بھی اپنے کُل سے اس قدر جُڑا ہوا اور وابستہ ہے کہ، اس کا تحفظ، اس کی بقاء اور اس کی نشوونما

---

[1] تعلیمی خطبات ص۱۲۸

اور صلاح و فلاح، اُس کے کُل کے ساتھ مربوط ہے۔

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

چنانچہ ذاکر صاحب نے جہاں جہاں تعلیمی خطبات میں اظہارِ خیال کیا ہو یا بنیادی تعلیم کی بات اپنی اسکیم میں پیش کی ہو انھوں نے اِن امور سے صرفِ نظر نہیں کیا ہے۔ تعلیم اُن کے نزدیک ایک قومی مسئلہ ہے اور ہماری قومی زندگی کا انحصار اس کی تعلیم پر ہے اور تعلیم ہی ہے جو قوم کے ماضی کو اس کے حال سے اور حال کو اس کے مستقبل سے ملاتی ہے۔ اپنے ایک خطبے میں وہ کہتے ہیں:

"قومی زندگی میں تعلیم اسی طرح گذرے ہوئے زمانے سے موجودہ زمانے کو ملاتی ہے جیسے اکیلے آدمی کی زندگی میں اس کا حافظہ۔ جو سماج اپنی تعلیم کا نظام درست نہیں رکھتی وہ اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتی ہے اور جس طرح حافظے کے ختم ہو جانے سے اکیلی زندگی کا سلسلہ باقی نہیں رہتا اسی طرح قومی تعلیم نہ ہونے سے قومی زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔"[1]

قومی زندگی میں جب تعلیم کی ایسی اساسی اہمیت ہو تو تعلیم کو ایک آزاد ادارے کے بطور کام انجام دینا چاہیے۔ ذاکر صاحب نے حکومت یا کسی بھی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے کی تعلیم پر بالادستی کو مسترد کیا ہے۔ وہ تعلیمی اداروں اور بالخصوص ہماری جامعات کی خودمختاری پر زور دیتے ہیں اور تعلیم کے معاملات میں انتظامیہ کی مداخلت اُن کے نزدیک منفی نتائج کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انتظامیہ کو انھوں نے کوئی ثانوی حیثیت دی ہو، قومی تعلیمی نظام میں اُن کے نزدیک طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ، تینوں کی مساوی اہمیت ہے۔ اور ان تینوں کے مابین معقول اور متوازن تعاون اور اشتراک پر ہی تعلیمی نظام کی کامیابی ممکن

---

[1] "تعلیمی خطبات" ص ۱۸

ہے۔ چنانچہ انھوں نے جس طرح طلبہ اور اساتذہ کی فلاح و بہبود اور ترقّی کے لیے
مختلف تجاویز پیش کی ہیں، انتظامیہ کو بھی بہتر اور موثر بنانے کے بارے میں اپنے
خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ اس کا بھی ثبوت ہے کہ ذاکر صاحب نے خود کو تدریس
ہی سے متعلّق نہیں رکھا بلکہ تنظیم سے بھی وہ ایسے ہی متعلّق رہے۔ بالخصوص جامعہ
ملیہ اسلامیہ سے اُن کی وابستگی۔ اس سلسلے میں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ انھوں
نے صرف ہمارے ہی ملک کے تعلیمی مسائل کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ اُن کے خطبات
سے ظاہر ہے کہ دیگر ممالک کے تعلیمی مسائل اور موضوعات کا بھی جب بھی موقع ملا،
انھوں نے مطالعہ کیا اور جائزہ لیا ہے چنانچہ اُن کے ہاں چین، امریکہ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ
اور برطانیہ وغیرہ کے ماہرین تعلیم اور تعلیم کے قوانین کا اکثر حوالہ ملتا ہے۔ اور پھر ذاکر صاحب
تعلیم کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے صرف مسائل ہی کو پیش نہیں کرتے بلکہ طلبہ
اور خاص طور پر کم عمر بچّوں کی نفسیات، سزا کے متعلّق اُن کے احساسات، اُن کے ہکلانے
کے اسباب و علل اور اُن کو دُور کرنے کی ترکیبیں، بچّوں کے ہمجولیوں، بھائی بہن
اور اُن کے کھیل کود، ماں باپ کی ذمہ داریوں اور استادوں کے رویّے ـــ غرض
ایسی کئی باتوں سے وہ تعلیمی خُطبات کو پُر مغز اور دستاویزی اہمیت کا حامل بنا دیتے
ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ تعلیم کو وسیع، معتبر اور کار آمد بنانے کے لیے ذاکر صاحب نے
اخلاقی پہلوؤں پر بھی زور دیا ہے کیونکہ اخلاقی عناصر کے بغیر تعلیم قومی زندگی میں اپنا
کردار ادا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح دینی اور روحانی تعلیم پر بھی ذاکر صاحب نے
اصرار کیا ہے کہ ایک صالح معاشرہ تشکیل پائے لیکن یہ تعلیم ایسی نہ ہو کہ مذہبی تنگ نظری
اور فرقہ واریت کو پروان چڑھنے کا موقع ملے بلکہ اس تعلیم کا انداز یہ ہو کہ مذہبی
وسیع النظری، رواداری، انسان دوستی اور بھائی چارگی کے جذبات عام ہوں۔ ان
سارے پہلوؤں پر نظر رکھنے ہی کا سبب ہے کہ ذاکر صاحب کا تعلیمی نظام ایک
جامع اور مکمّل تعلیمی نظام ہے جو ادھر سماج کی مادّی ضرورتوں کی تکمیل پر زور دیتا
ہے تو اسی کے ساتھ روحانی قدروں پر بھی۔ ۲۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو کلکتہ یونیورسٹی کے

جلسۂ تقسیمِ اسناد سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے انتہائی جامعیت کے ساتھ اس سمت اشارہ کیا ہے:

"یہ ایک خطرناک رجحان ہے کہ مادی بہبودی پر زور دیتے ہوئے روحانی قدروں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ میں سماجی اور مادی زندگی کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ تعلیم کو اور اسی باعث جامعات کو انفرادیت اور روحانیت سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیئے۔ یوں بھی جامعات اِن امور سے صرفِ نظر کرلیں تو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ عمدہ تعلیم کا جواز اسی میں ہے کہ فرد کی زندگی کو بھرپور بنایا جائے اور اس کی روحانیت کی خاطر خواہ نشوونما کے امکانات پیدا ہوں[1]۔"

ذاکر صاحب نے تعلیم میں مقصدیت اور افادیت پر زور دیا اور بہت زیادہ۔ انھوں نے دستکاریوں اور اسی نوعیت کے کاموں کے ذریعہ تعلیم کو ایک سمت دینے کی مقدور بھر سعی کی۔ زرعی، طبی اور انجینئرنگ کی تعلیم کی قدر و قیمت کا انھوں نے احساس کیا اور دوسروں کو بھی یہ احساس دلانا چاہا لیکن ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے صرف مشینی سماج پیدا کرنا چاہا ہو، جہاں ہر طرف مشینیں، صنعتیں اور کارخانے ہوں، کل پرزوں کے بازار ہوں اور انسان بھی ایک کل پرزہ ــــ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ذاکر صاحب صنعت و حرفت کی اہمیت پر اصرار کرنے کے باوصف شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کے پرستاروں میں رہے۔ فنونِ لطیفہ کی اپنی بھی افادیت کیا یہی کم ہے کہ یہ انسان کو انسان رکھتے ہیں ــــ ۱۰ مارچ ۱۹۶۲ء کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کھڑک پور کے جلسۂ تقسیمِ اسناد سے تخاطب کرتے ہوئے ذاکر صاحب

---

[1] Zakir Husain "The Dynamic University"
Asia Publishing House
Bombay-Reprinted 1969 P. 18.

نے کہا :

" ہم کو نہیں بھولنا چاہیے کہ ہر انجینئر میں ایک انسان بھی ہوتا ہے اور خود انجینئر کو بھی زندگی کے لذائذ سے بہرہ مند ہونے کے لیے اس انسان کو جاننا چاہیئے۔ اگر وہ مشین بناتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے ذہن کو بھی ایک مشین بنا دے اور عمدہ شاعری عمدہ موسیقی، عمدہ کتابوں اور عمدہ انسانی تعلقات سے لطف اندوز ہونے کے جذبات سے محروم ہو جائے۔ اگر وہ مشین بنا سکتا ہے تو وہ ان اثرات سے بے تعلق نہیں ہو سکتا جو ان مشینوں کی وجہ سے سماج پر مرتب ہوتے ہیں[1]

ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات صرف تعلیمی خطبات نہیں ہوتے کہ تعلیمی موضوعات ہی کا احاطہ کرتے ہوں جب وہ تعلیم کا سماج سے انسلاک کرتے ہیں تو گویا اُن کے تعلیمی خطبات بھی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے میں سمیٹ لیتے ہیں۔ معاشرت، سیاست، معیشت، قومیت، اخلاق ــــ اور کیا کچھ ان کا موضوعِ گفتگو نہیں ہوتا۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ کہیں بھی سطحی اور برائے نام نہیں گذرتے بلکہ پوری دردمندی اور اخلاص کے ساتھ متعلقہ موضوع کا حق ادا کرتے ہیں، موقع سے کماحقہٗ استفادہ کرتے ہوئے خاصے تجربے کے بعد اپنے افکار کا حاصل پیش کرتے ہیں ــــ

۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کے ہندوستان کا تصور کیجیے، ملک کی کیا حالت ہے، کن الجھنوں سے دوچار ہے، اسباب وعلل خواہ کچھ ہوں، فرقہ واری قوتیں سر اٹھا رہی ہیں، ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ کئی ایک نے بلاشبہ کئی ایک نے دل پر جبر کر کے اپنی آنکھوں سے اس صورتِ حال کا نظارہ کیا ہوگا۔ ذاکر صاحب نے بھی اپنی روح کی بے چینی اور قلب کی بے کلی کی پردہ پوشی نہیں کی۔ وہ

---

[1] "The Dynamic University" P. 91.

شاید کر بھی نہیں سکتے تھے۔ جامعہ نگر میں منعقدہ دوسری تعلیمی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ۱۱ر اپریل ۱۹۴۰ء کو انھوں نے اپنے جذبات کو برافگندۂ نقاب کیا۔ بڑی تڑپ، بڑی کسک کے ساتھ۔ اُن کے الفاظ ملاحظہ ہوں ــــــ ہمارے وطنِ عزیز کا نقشہ:

" ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں۔ اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے اور جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جہاں بھائی ایک دل نظر نہیں آتے۔ کوئی قدر آخری قدر معلوم نہیں ہوتی۔ جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں۔ کوئی دکھ نہیں جسے سب بانٹیں[1]"

ذاکر صاحب کے نزدیک اس صورتِ حال کی بیشتر ذمہ داری بلاشبہ سیاست دانوں پر عاید ہوتی ہے اور وہ اگر وقت کی رفتار کا اندازہ لگائیں اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں تو شاید کوئی بات بن سکے۔ اسی دوسری تعلیمی کانفرنس میں بابو راجندر پرشاد بھی موجود ہیں کہ کانفرنس کا افتتاح کریں۔ بابو راجندر پرشاد کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلکہ ان کو مخاطب کرتے ہوئے اور اُن کی معرفت گویا سارے سیاست دانوں سے ذاکر صاحب کا خطاب ہوتا ہے۔ کیسے دو ٹوک کھرے اور تکلف بر طرف والے لہجہ میں۔ سماعت فرمائیے

" خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھاریے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے۔ کمزوروں کو زور آوروں کا ڈر نہ ہو۔ غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے

---

[1] "تعلیمی خطبات" ص ۹۱-۹۲

جس میں تمدن تمدن، امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں
اور ایک دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں۔ جہاں ہر ایک وہ بن سکے
جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری
قوت کو اپنی سماج کا چاکر جانے[1]

اور پھر ہمارے ملک میں اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کے مؤقف، اُن کے کردار اور مسائل کے بارے میں ذاکر صاحب نے بڑی صاف گوئی اور جرأت مندی سے کام لیا ہے۔ ذاکر صاحب ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ ترین شخصیت ہی نہیں تھے بلکہ ایک مثالی کردار بھی کہ اُن کی تقلید آج بھی ہمارے لیے باعثِ شرف و اعتبار کہی جائے گی ـــ وہ لوگ جو مسلمانوں کی قیادت کے مدعی ہیں اور اُن کے مسائل کا دَم بھرتے ہیں، وہ آج بھی ذاکر صاحب کے خطبات، اُن کے افکار و خیالات سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا ذاکر صاحب آج بھی اُن کے رہنما اور قاید ہیں ـــ
۱۴ اگست ۱۹۳۵ء کاشی ودیا پیٹھ کا جلسۂ تقسیم اسناد ہے۔ اپنے خطبہ میں ذاکر صاحب نے اور جن پہلوؤں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہو، اُن کا یہ خطبہ اس زاویہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے اس میں تعلیم کی بنیاد کو متعلقہ گروہ کے تمدن پر رکھنے پر زور دیا کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا تقاضہ یہی ہے، اُن کے الفاظ ہیں:

"مسلمانوں کو جو چیز ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے۔
اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا
صحیح تصوّر نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے۔ وہاں اس شدید شبہے کا بھی
بڑا حصّہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے
فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حالت میں یہ قیمت ادا کرنے

---

[1] تعلیمی خطبات ص۹۱

پر راضی نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچّے ہندوستانی
کی حیثیت سے بھی، اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے
ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا
سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدّن پستی میں کہاں سے کہاں
پہنچ جائے گا۔[1]"

میں ایک چھوٹا سا اقتباس اور دیتا چلوں اور اس سے پہلے یہ عرض کردوں
کہ یہ بات جس کو ہمارے بیشتر سیاست داں کئی قایدین کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔
شاید یہ کہہ بھی نہیں سکتے، ذاکر صاحب نے کتنی خوش اسلوبی کے ساتھ، کسی ذہنی
تحفّظ کے بغیر اور کیسے دل آسا انداز میں کہہ دیا ہے۔ گویا یہ انہی کا حق تھا اور
انھوں ہی نے ادا کر دیا:

"ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ
ہندوستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی
گوارا نہ کریں گے جس میں اُن کی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ اُن کا
حوصلہ ہے کہ اچھّے مسلم ہوں اور اچھّے ہندی۔ اور نہ کوئی مسلمان اُن
کے ہندی ہونے پر شرمائے اور نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے
پر انگلی اٹھائے۔[2]"

ذاکر صاحب نے عام تعلیمی اداروں اور جامعات ہی میں خطبات نہیں دیے
بلکہ انجنیئرنگ، ٹکنیکل، طبّی اور زرعی اداروں سے بھی انھوں نے خطاب کیا ——
تعجّب ہوتا ہے کہ اُن کے معلومات کا خزانہ کتنا وسیع تھا۔ اگر وہ کسی زرعی
یونیورسٹی کا خطبہ دیتے ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی ماہر زراعت ہیں۔
گنّے کی کاشت کے بارے میں، مانسون کے تعلّق سے، عام پیداوار میں اضافہ

---

[1] "تعلیمی خطبات" صہ ۲۴ [2] "تعلیمی خطبات" صہ ۲۴

کیوں اور کیسے ہو، اور مجموعی طور پر زرعی منصوبہ بندی پر اپنے خیالات وہ ایسی روانی کے ساتھ اور موضوع پر گرفت رکھتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح انجنیئرنگ، فنّی اور سائنسی اداروں اور جامعات سے خطاب کرتے ہوئے کبھی مین کے طریقۂ تعلیم کے بارے میں کہیں گے تو کبھی امریکہ کے فنی اداروں کے بارے میں کبھی کیمسٹری کے فارمولوں کا ذکر ہوگا تو کبھی لوہے اور فولاد کی خاصیتوں اور اُن کی تشکیل وغیرہ کے بارے میں ــــ گویا یہی ان کا موضوع خاص رہا ہے۔ میں اس سلسلے میں خاص طور پر ۱۰ مارچ ۱۹۶۲ء کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، کھڑک پور کے جلسۂ تقسیم اسناد میں دیے گئے اُن کے خطبہ کا حوالہ دوں گا جس میں انھوں نے فنّی تعلیم کے بارے میں معمولی معمولی پہلوؤں پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ اسی طرح طبّی اداروں سے خطاب کرتے ہوئے وہ ایسی دسترس، مہارت اور قدرت کے ساتھ طب کے فنّی اور علمی رخوں پر اظہارِ خیال کرتے اور قطار اندر قطار حوالے دیتے ہوئے گذرتے ہیں گویا وہ ماہر طبیب ہوں۔ امراض کی پیچیدگیوں، طبّی اصطلاحوں، طبیبوں اور اُن کی تصانیف، تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں قاہرہ اور تبریز وغیرہ میں قائم شفاخانوں اور اُن کی تفصیلات، فلے ڈلفیا میں پہلے بخارا اور یورپ میں کبھی پھیلے چیچک، طاعون اور ملیریا کا تذکرہ، کہیں کہیں تو جزئیات، سنین اور اعداد و شمار کے ساتھ پیش کرتے جاتے ہیں۔

ذاکر صاحب نے متنوع موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہ موضوعات جو بالعموم خشک متصوّر کیے جاتے ہیں، ذاکر صاحب نے ان کو گویا نکھار دیا ہے ــ ایک کامیاب (ORATOR) کی طرح ذاکر صاحب جانتے ہیں کہ اپنی بات کس طور پر پیش کی جائے کہ حاضرین کی توجہ ہر طرح سمیٹے رکھیں، چنانچہ انھوں نے ان خشک سے خشک اور سنجیدہ سے سنجیدہ موضوعات کو بھی انتہائی شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔ فلسفیوں اور مفکروں کے اقوال و احوال سے تو وہ کام لیتے ہی ہیں اس سے قطع نظر بھی کہیں ہلکے پھلکے قصے سنا کر، کہیں شستہ سے لطیفوں کو پیش

کرکے، کہیں کوئی شعر سنا کر، کہیں دھیمے سے طنز سے کام لے کر اور کہیں کوئی اچھا سا جملہ قولِ محال کہہ کر وہ اپنے خطبہ کے اصل مقصد کو حاضرین کے دل نشین کر دیتے ہیں اور یہ چیز اُن کے اردو خطبات میں بھی ہے اور انگریزی خطبات میں بھی۔
میں یہاں اردو خطبات سے چند فکر انگیز جملے بطورِ مثال پیش کرتا ہوں :

"تعلیم تو نام ہی ماضی کے ذہن معروض کو حال کے ذہنِ موضوع میں منتقل کرنے کا ہے۔"[1]

"اخلاق کی دنیا میں یہ معلوم ہونے سے کہ نیکی کیا ہے آدمی نیک تو نہیں ہو جاتا۔ نیک بننے کے لیے نیکی کرنا بھی تو لازم ہے۔"[2]

"شخصیت کائنات کی شاید سب سے گراں بہا متاع ہے۔ اس پر فرشتے رشک کر سکتے ہیں اور خالقِ کائنات اپنے شاہکار پر ناز کر سکتا ہے۔"[3]

"آدمی کی تاریخ پر نظر ڈالیے، اس کی بڑی بڑی محرومیاں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ یہ جن چیزوں کو پہلے کسی کام کا ذریعہ بناتا ہے، ہوتے ہوتے اسی ذریعے کو اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔"[4]

تعلیمی خطبات عام طور پر رسمی نوعیت کے متصوّر ہوتے ہیں۔ چلتے چلاتے موضوع پر صاحبِ خطبہ نے کچھ کہہ دیا، ہم نے سن لیا اور پھر خدا حافظ! ان خطبات کے لیے عام طور پر کسی اونچے اور اعلیٰ منصب پر فائز اور بھاری بھرکم صاحب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ لوگ ان خطبوں کو سننے نہیں آتے بلکہ ان اونچے اور اعلیٰ منصب پر فائز اور بھاری بھرکم شخصیت کو سننے اور اُس سے مرعوب ہونے آتے ہیں۔ ذاکر صاحب اونچے اور اعلیٰ ترین منصب پر فائز بھی رہے اور بذاتِ خود بھاری بھرکم شخصیت کے حامل بھی تھے لیکن اُن کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ اپنے خطبات کے ذریعہ سامعین

---

[1] "تعلیمی خطبات"، ص ۱۵۹ [2] تعلیمی خطبات ص ۱۰۲

[3] تعلیمی خطبات ص ۲۰۱ [4] تعلیمی خطبات ص ۱۳۱

سے اپنی مخاطبت کو پوری طرح کام میں لاتے، موضوع کا ممکنہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیتے اور اس کے ہر ہر رُخ کو اُجاگر کرتے اور گویا خطبہ تحریر کرتے ہوئے اس خصوص میں اپنے سارے تجربات اپنے مطالعے، اپنی دانش اور آگہی سے پوری طرح استفادہ کرتے۔ تب ہی تو ایسی حاصلِ کلام اور نکتہ رس باتیں ممکن ہیں۔ اُن کے تجربات کا نچوڑ، سننے والوں کے لیے مشعلِ راہ۔ ایک دو اقتباس پیش کر دوں گا:

"اکیلا آدمی بطور جانور کے سمجھ میں آسکتا ہے مگر پورے انساں کی حیثیت سے جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے، اس کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔ ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جا سکتا ہے۔ ذہنی زندگی میں "تُو" نہ ہو تو "میں" کا وجود بھی نہ ہو اس لیے زندگی کے لیے جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے سماج کا وجود لازمی ہے"[1]

اور یہاں دیکھیے۔ استاد، ایک اچھے استاد کے کردار کو وہ کیسی عمدگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اچھا استاد اہلِ قوت اور حکمراں نہیں ہے لیکن اہلِ قوت اور حکمرانوں سے بھی اس کی مرتبت فزوں:

"اچھے استاد میں اہلِ قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرّہ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حکمراں جبر کرتے ہیں، یہ صبر کرتا ہے، وہ مجبور کرکے ایک راہ پر چلاتے ہیں، یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے۔ ایک کے وسائل میں تشدّد اور زبردستی، دوسرے کے محبت اور خدمت۔ ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے۔ دوسرے کا شوق سے۔ ایک حکم دیتا ہے، دوسرا مشورہ۔ وہ غلام بناتا ہے اور یہ ساتھی"[2]

---

[1] تعلیمی خطبات ص ۱۶، ۱۷ [2] تعلیمی خطبات ص ۱۴۴

ذاکر صاحب کے خطبات میں نفسِ مضمون کی جہاں اہمیت ہوتی ہے، ان کا اسلوب بھی نظر کو طراوت، ذہن کو تسکین اور دل کو سرور بخشنے والا ہوتا ہے۔ معاشیات پر اُن کی کتاب موضوع سے انصاف ہی نہیں کرتی، ادب پارہ کی حیثیت سے بھی اپنا مقام رکھتی ہے۔ افلاطون کی "ریاست" کا انھوں نے ترجمہ کیا اور یہ گویا اُن کی ریاست بن گئی۔ اسلوب کے زاویے ـــــ اس ریاست میں ہر ہر مقام پر ذاکر صاحب کی حکمرانی ہے۔ انھوں نے مضامین، کہانیاں اور بہت کچھ لکھا، ہر ہر سطر کہتی ہے کہ میرا لکھنے والا اور کوئی نہیں ذاکر حسین ہے۔ یہی ذاکر صاحب کے اسلوب کی خوبی اور ندرت ہے۔ تعلیمی خطبات ـــــ انگریزی میں ہو کہ اردو میں، انھوں نے اسلوب کا جادو جگا دیا ہے لیکن یہ اسلوب کچھ حلاوت، خنکی اور گداز ہی نہیں رکھتا اور نہ صرف ولولہ، ہمہمہ اور گھن گرج کا حاصل ہے۔ نہ یہ سپاٹ، کھردرا اور بے رس ہے اور نہ شیرینی اور رچاؤ ہی سے عبارت۔ مجھے کہنے کی اجازت دیجیے، ذاکر صاحب کو پتھر اور پھول دونوں پسند تھے۔ ذاکر صاحب کا اسلوب بھی اِن دونوں کے اوصاف سے ترکیب پاتا ہے۔ اس میں صلابت بھی ہے اور نرمی بھی۔ سختی بھی ہے اور گداز بھی۔ ایک ہمہمہ بھی ہے اور دھیما پن بھی، گھن گرج بھی ہے اور سرگوشیوں کا انداز بھی۔ دھوپ کی تمازت بھی ہے اور چاند کی خنکی بھی۔ پتھر کی کرختگی بھی ہے اور گلاب کی نرماہٹ بھی ـــــ پس مختصر یہ ہے کہ یہ ذاکر حسین کا اسلوب ہے۔ الفاظ کا انتخاب کچھ ایسا کہ بس الفاظ کا انتخاب یہی ہونا چاہیئے تھا۔ معنوی تہہ داری کا حاصل، فصیح بھی، بلیغ بھی ـــــ میں یہاں ایک نہیں اُن کے ہر خطبے سے ایک سے زیادہ اقتباسات دے سکتا ہوں کہ اُن کا اسلوب ہر موقع پر اپنی نیرنگیوں کی جلوہ گری کرتا ہے لیکن میں یہاں خاص طور پر اُن کے صرف ایک خطبے کا حوالہ دوں گا۔ ۲۸ جنوری ۱۹۵۷ء کو انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ دیا۔ یقیناً آج بھی کئی افراد ہوں گے جنھوں نے ذاکر صاحب کا یہ خطبہ اُن سے سُنا ہوگا۔ یہ افراد ذاکر صاحب کے اسلوبِ تحریر ہی کے نہیں اُن کے طرزِ خطابت کی

بھی داد دیں گے۔ لیکن ہر وہ شخص جس نے یہ خطبہ پڑھا ہے اور جو آئندہ پڑھے گا ذاکر صاحب کے سحر آگیں اسلوب اور قومی تعلیمی مسائل سے اُن کی بے نہایت جذباتی وابستگی کی داد دیتا رہے گا۔ اسلوب کے زاویے سے بھی یہ خطبہ بڑا منفرد اور امتیازی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کا بہترین دور گزارا۔ اُن کے قریبی اور بے تکلف احباب میں زیادہ تر علی گڑھ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومی زندگی میں علی گڑھ کا مستحسن کردار۔ خود ذاکر صاحب کا بھی علی گڑھ سے گہرا اور جذباتی تعلق رہا۔ مسلم یونیورسٹی کی زندگی میں جو نشیب و فراز آئے ذاکر صاحب نے ان سب کا نہایت قریب رہ کر گہرائی اور خلوص کے ساتھ جائزہ لیا۔ چنانچہ یہ خطبہ دیتے وقت لگتا ہے یہ ساری یادیں صورتِ سیلاب اُمڈ آئی ہیں۔ وہ اپنے آپ پر قابو رکھتے ہیں پر قابو نہیں رکھتے۔ الفاظ اُن کے جذبات و احساسات کا ساتھ شاید نہیں دے پا رہے، اُن کی آواز بھیگ جاتی ہے، لہجہ گلوگیر ہو جاتا ہے۔ یہ ایک تعلیمی ہی نہیں ادبی خطبہ بھی ہے۔ یہ زبان و بیان پر قدرت نہیں، زبان و بیان کا فنکارانہ استعمال ہے۔ کتنا اور کیسا فنکارانہ کیف و کم کا حامل، ملاحظہ ہو :

> "وقت صرف گھڑی کی سوئیوں ہی سے نہیں ناپا جاتا، جس پر یہ گزرتا ہے، اس کی کیفیت بھی اس کا ایک پیمانہ ہے۔ کبھی چند منٹ، انتظار اور مایوسی کے چند منٹ پہاڑ بن جاتے ہیں کبھی کشفِ حقیقت، قصدِ نیک، مشاہدۂ جمال، مجاہدانہ سرفروشی کے ایک لمحہ میں ازل اور ابد سمٹ کر سما جاتے ہیں۔ کبھی بے مقصدی، بے راہ روی، بے دلی میں پوری پوری عمر بیت جاتی ہے کہ گھڑی کا ایک منٹ بھی اس پر حقارت سے ہنستا ہے۔"[1]

---

[1] "تعلیمی خطبات" ص ۷۳-۲۷۲

اور پھر وقت، سلسلۂ روز و شب، جو نقش گر حادثات ہے، پیچھے کی طرف لوٹتا ہے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۷ء تک (۴۴) برسوں کا عرصہ، ذاکر صاحب کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے، جیسے وہ سب کچھ ہو چکا ہے وہ ابھی ہو رہا ہے۔ جو گذر چکا ہے، وہ ابھی گذر رہا ہے، اقتباس طویل ہے اور بہت طویل۔ ہو بھی کیوں نہیں، ۴۴ برسوں کے عرصہ کو جو محیط کرنا ہے لیکن غور کیجیے جذبات کی کتنی ہنرمندانہ عکاسی ہے، کتنی شیریں، شستہ اور شائستہ زبان، کیسا رچا ہوا اسلوب، کیسی دل کشی، کیسی ندرت:

"۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے، مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق۔ یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دلگیر ہونا سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا۔ یہاں دوست پائے، دوست کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے، بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا، اپنی قومی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا دیکھے، پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں، اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا۔ اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا، سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے شعلے کی طرح بھڑک بھی اٹھے، مگر سچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا، صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو و نما دے سکنے کے لیے ان میں زندگی کی تند اور تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت، مگر سیرت کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت۔ یہیں

پہچانی۔ خلوت وجلوت کی جداجدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا۔ یہاں فرمانبرداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب۔ سعادت مندی اور وفاشعاری کے ساتھ خود اختیاراً اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی، باغی بنے، نکالے گئے، دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی مگر اس مادرِ علمی کی طرف دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی، بن باس میں بھی دِل اسی میں اٹکا رہا۔ حالات بدلے، ملک آزاد ہوا، یہاں کا نظام بھی بدلا، ذمّے دارانہ حیثیت سے اس کی خدمت کا موقع میسر آیا۔ بُری بھلی جو بن پڑی خدمت کی اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سرِ شوریدہ کو یہیں بالینِ آسائش نصیب ہو جائے گی، مگر یہ مقدّر نہ تھا۔ صحت کی خرابی فرائض کی انجام دہی میں مخل ہوتی رہی۔ بالآخر محبت پر ذمہ داری کے احساس نے غلبہ پایا اور میں آپ سے رخصت ہو گیا۔

آج کاسۂ دل، کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے، اس سب پر جو یہاں سے پایا شکر گذاری سے بھرا ہے اور ان تمام کوتاہیوں پر جو اس دانش گاہِ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں، شرمساری سے بھی چھلک رہا ہے۔ میرے لیے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی زندگی کا بڑا انعام ہے۔[1]

---

[1] تعلیمی خطبات ص ۲۷۵-۲۷۳

ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات کے اس مختصر سے جائزے کی روشنی میں بھی اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ خطبات تعلیمی ہی نہیں، ادبی خطبات بھی ہیں، ان کی سماجی اور اخلاقی حیثیت بھی ہے و نیز ان کی تعلیمی نوعیت کا جہاں تک تعلق ہے یہ ایک سوالیہ نشان ہے کہ گاندھی جی، ذاکر صاحب اور اُن کے رفقاء نے ہندوستان کے قومی تعلیمی نظام کا جو خواب دیکھا تھا وہ آج کہاں تک پورا ہوا ہے؟ اور کیا کبھی وہ پورا ابھی ہوگا؟ قومی تعلیمی حکمت عملی کی جاریہ بیش رفت میں، کل کیا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا یوں بھی دشوار ہے کہ ہم نے کل جو تجاویز اور سسٹم وغیرہ رد کیے تھے، آج اُن کو قبول کر رہے ہیں اور آج جن کو رد کیا جا رہا ہے، کیا عجب، کل وہ پھر قابلِ قبول سمجھے جائیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کو تعلیم کا عبوری یا تحلیلی دور قرار دیں، یا کچھ اور ــــــ لیکن آیا اس سے کوئی انکار کرے گا کہ ہمارے وطنِ عزیز میں قومی تعلیم کا کوئی زیادہ بہتر، زیادہ قابلِ قبول اور زیادہ دیرپا نظام درکار ہو تو اس کو ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات اور اُن کے افکار سے اجالا لینا پڑے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے لیے کچھ ایسے زیادہ دنوں کی ضرورت ہے۔ ❊ ❊

عبداللطیف اعظمی

ذاکر صاحب۔ مکاتیب کی روشنی میں

کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کے نجی خطوط، اس کی شخصیت، اندرونی کیفیت اور اس کے ذاتی احساس و رجحانات کے بہتر آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس لیے ذاکر صاحب کی شخصیت اور اُن کے صحیح خیالات و افکار کو سمجھنے کے لیے اُن کے خطوط کا مطالعہ ضروری ہے، خاص طور پر اس لیے اور ضروری ہے کہ ذاکر صاحب بالعموم نجی صحبتوں کے علاوہ کسی اور موقع پر زندگی کے مختلف مسائل پر کھل کر اظہارِ خیال کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ نیز خطوط کے علاوہ اپنے بارے میں ان کی کوئی اور تحریر نہیں ہے، جس سے اُن کے دل و دماغ کو سمجھا جاسکے۔ لیکن خطوط کا مطالعہ یا ان کا جائزہ لینے سے قبل بہتر ہوگا اگر اُن کی طبیعت، اُن کے مزاج ان کے طریقِ کار اور اُن کی زندگی کے چند اہم پہلوؤں پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

ذاکر صاحب اگرچہ اپنے نام کے ساتھ "خان" لکھنا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی یہ پسند کرتے تھے کہ کوئی اور شخص اُن کو خان کہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ خاندانی لحاظ سے وہ کھرے اور ٹیپیکل پٹھان تھے۔ اور ایسے غیور پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس کا کوئی فرد اگر اتفاق سے فلکِ کج رفتار کی زد میں آجائے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جائے تو ایسی حالت میں بھی وہ اپنی آن بان اور عزتِ پٹھانیت کی حفاظت کے لیے اپنے ساتھ اپنی تلوار رکھنا نہیں بھولتا۔ ذاکر صاحب نے خود تو کبھی کوئی تلوار نہیں رکھی۔ مگر اپنی عزتِ نفس کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اپنی ذاتی ضرورت کے لیے نہ سہی لیکن جامعہ کی خاطر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑا، تو ان کا رکھ رکھاؤ اتنا شاندار اور شخصیت اتنی عظیم

تھی کہ دینے والا خود اپنے آپ کو چھوٹا محسوس کرتا تھا اور اس پر فخر کرتا تھا کہ ذاکر صاحب جیسی بلند شخصیت کو خوش کرنے یا ان کی خواہش کو پورا کرنے کی اُسے عزت اور سعادت حاصل ہوئی۔ قدرت نے ذاکر صاحب میں وجاہت کے ساتھ ساتھ، پوری فیاضی سے ذہانت بھی عطا کی تھی، وہ جس مجلس میں ہوتے، اُن کا وزن محسوس کیا جاتا اور وہ بہت جلد سب پر چھا جاتے۔

وہ ان ایسے اداروں کے سرپرست تھے جن کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، البتہ اس کے پاس مطالبات کی فہرست بہت لمبی تھی۔ ایک طویل عرصے تک وہ اپنے ساتھیوں کو صرف اس لیے مطمئن اور متحد رکھ سکے کہ اگر کہیں سے کچھ روپے آ گئے تو سب سے پہلے وہ اپنے مخلص ساتھیوں کی ضرورت پوری کرتے، اس کے بعد اگر گنجائش ہوتی تو اپنے اور اپنے گھر والوں کی۔ قدرت نے ان کو ایسی قابلیت اور صلاحیت عطا کی تھی کہ وہ بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے اور آرام سے زندگی بسر کر سکتے تھے مگر انھوں نے قوم و ملک کی خدمت کو ترجیح دی اور ایک ایسے ماحول میں جہاں خلوص اور ایثار کا اعتراف کرنے والے کم اور اعتراض کرنے والے زیادہ تھے۔ عمر کے آخری حصے میں خدمت کے میدان میں ذرا وسعت پیدا ہوئی اور ملک و قوم کی وسیع تر ضروریات اور تقاضوں کے پیش نظر اور قومی رہنماؤں کے اصرار پر، اپنی محدود دنیا سے نکل کر وسیع دنیا میں داخل ہوئے، تو بعض لوگوں نے شک وشبہہ کی نظر سے دیکھا اور اس کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ تنگی و ترشی میں گذارا ہے اور اس نے ایثار و قربانی کا ایک اعلا معیار پیش کیا ہے، وہ یکایک بدل کیسے سکتا ہے۔ بعض معترضین نے اسے بھی نظر انداز کر دیا کہ جامعہ ملیہ نہ تو علی گڑھ یونیورسٹی ہو سکتی ہے اور نہ ہی دارالعلوم دیوبند۔ یہ دونوں کا امتزاج ہے اور دونوں سے بڑی حد تک الگ۔ مگر ذاکر صاحب نے انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ ان اعتراضات کو برداشت کیا اور محض اعلا مقاصد کی خاطر ان کو مطمئن کرنے کی پورے خلوص کے ساتھ کوشش کی۔

ذاکر صاحب کو ان کی زندگی ہی میں دو محاذوں پر شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک مذہب کے محاذ پر، جس کے نمائندے مولانا عبدالماجد دریا آبادی تھے اور اس کا مرکز ان کا ہفتہ وار اخبار صدق یا صدقِ جدید تھا' دوسرے سیاست کے محاذ پر جس کا آغاز ۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ جس کے خصوصی نمائندے چودھری غلام احمد پرویز تھے، اور اس کا مرکز ان کا ماہنامہ "طلوعِ اسلام" تھا۔ یہ مخالفت اس شخص کی تھی جو مذہبی اقدار کا بہت بڑا علمبردار تھا اور علمائے کرام کی بے حد عزت کرتا تھا۔ سیاست کے معاملے میں قوم پرور ضرور تھے اور جامعہ کی بنیاد انہیں لوگوں نے ڈالی تھی جو کانگریس میں نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے مگر جب ذاکر صاحب نے جامعہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو یہی ذاکر صاحب تھے جنھوں نے اپنے ساتھیوں سے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ جس کو جیل جانا ہو وہ شوق سے جائے مگر جامعہ سے استعفا دے کر۔ اسی طرح ۱۹۴۲ء کی تحریک کے موقع پر کانگریس کے لوگوں کو شکایت تھی کہ جامعہ کے لوگ اس سے الگ تھلگ ہیں۔ یہ شکایت گاندھی جی تک پہنچی تو انہوں نے ذاکر صاحب اور جامعہ کے موقف کی تائید کی اور فرمایا کہ وہ لوگ تعلیمی محاذ پر جو کچھ کر رہے ہیں، وہ تحریکِ آزادی سے کوئی الگ چیز نہیں۔ غرض جامعہ نے ذاکر صاحب کی سربراہی کے بعد کبھی عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا، مگر ذاکر صاحب نے، جنھوں نے قومی تعلیم کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا، جب واردھا اسکیم کو تیار کرنے میں حصہ لیا تو مسلم لیگ کی طرف سے اتنی شدید مخالفت کی گئی کہ جامعہ کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ یہ ہیں ذاکر صاحب کی شخصیت کے چند اہم نقوش جنھیں ان کے خطوط میں تلاش کرنا ہے اور ان سے رہنمائی حاصل کرنا ہے۔

ذاکر صاحب کے بہت کم خطوط ابھی تک منظرِ عام پر آئے ہیں، مگر جس قدر آئے ہیں، ان سے ان تمام باتوں کی تصدیق ہوتی ہے جنھیں ابھی میں نے اختصار کے ساتھ عرض کیا ہے۔ خدا بھلا کرے مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم کا کہ انہیں ذاکر صاحب نے جس قدر خطوط لکھے تھے، نہ صرف یہ کہ اُن میں سے بیشتر کو محفوظ رکھا بلکہ اپنی زندگی ہی میں اس علمی خزانے کو مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں محفوظ کر دیا، جہاں ہر شخص

ان کا مطالعہ کر سکتا ہے اور ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ ان خطوط کی تعداد تقریباً پینسٹھ ہے اور اُن میں سے اہم خطوط کو جن سے ذاکر صاحب کی شخصیت اور کردار پر مفید روشنی پڑتی ہے۔ ابھی حال میں سہ ماہی اسلام اور عصر جدید کے مدیر محترم ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے ذاکر نمبر میں شائع کر دیا ہے جو اس وقت جلد سازی کے مراحل میں ہے۔ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد ذاکر صاحب کے صبر و ضبط اور اعلا کردار کی داد دینی پڑتی ہے۔ ذاکر صاحب مولانا ماجد صاحب کی جس خلوص اور عقیدت کے ساتھ عزت کرتے تھے، شاید ہی ان کے ہم عصروں میں کوئی اور کرتا ہو، اور انھوں نے جس شدت کے ساتھ اعتراضات کیے ہیں، اس کے بعد اچھے اچھے لوگوں کے قدم ڈگمگا جائیں گے۔ مگر ذاکر صاحب نے اوّل دن، جب وہ ایک چھوٹے سے ادارے کے سربراہ تھے، جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس پر اس وقت بھی عمل کیا جب وہ ایک ریاست کے گورنر ہوئے۔ اس وقت بھی جب وہ پورے ملک کے نائب صدر منتخب ہوئے اور اس وقت بھی جب وہ ملک کے سب سے بڑے عہدے پر سرفراز ہوئے، یعنی صدرِ جمہوریہ ہو گئے۔ اُن کے رویّے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی اور وہ اسی عقیدت اور خلوص کے ساتھ ان کے ساتھ پیش آتے رہے، جس طرح شیخ الجامعہ کی حیثیت سے پیش آتے تھے۔ ذاکر صاحب کے مختلف اَدوار کے خطوط سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ذاکر صاحب کا ایک خط ملاحظہ ہو۔ جسے انھوں نے نائب صدر منتخب ہونے کے تقریباً فوراً بعد لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "دہلی ضرور تشریف لائیے لیکن اگر سردیوں میں تشریف لائیں تو اچھا ہو۔ آج کل موسم بہت خراب ہے اور میں ابھی ٹھیک سے جما بھی نہیں ہوں۔ گھر آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ کوئی باورچی ملا نہیں ہے اس لیے آپ کو بلا کر زحمت دینا نہیں چاہتا۔"[۱]

اس کے بعد دوبارہ اس دعوت کی یاددہانی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> گرامی نامہ ملا۔ شکریہ۔ ۱۰ اگست کا انتظار رہے گا۔ ایک ایک دن گنوں گا۔ آیئے اور ضرور آیئے۔ آپ نے تشریف لانے کی بشارت کے

ساتھ پروگرام منسوخ ہو سکنے کا اندیشہ کیوں پیدا کر دیا؟ کیا اس میں
خوف ورجا کی درمیانی کیفیت پیدا کرنے کا تعلیمی نکتہ مضمر ہے؟ آپ نہ
آتے تو بڑی مایوسی ہوگی۔ ملے ہوئے مدتیں گزر گئیں ہیں۔"

اس سے پہلے بہار کی گورنری کے زمانے میں بھی اس قسم کی دعوت دی تھی۔ لکھا تھا:

"گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ کس طرح ادا کروں؛ جی ہاں
چارج لے لیا ہے، آپ بزرگوں کی دعائیں جو نہ ادا کرا دیں کم ہے۔ اپنی
نااہلی کا پورا احساس رکھتا ہوں، لیکن اب کہ یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی
ہے، دعا کرتا ہوں اور دُعا کا طالب ہوں کہ بے آبروئی نہ ہو۔ دعا کیجیے
کہ راج بھون میں فقیر، درویش کی طرح دن کاٹ دوں، غفلت مسلط
نہ ہو جائے۔ دیدۂ بیداری اور خدا اندیشی نصیب ہو۔"

اس کے بعد وہ ملاحظہ فرمائیے جس کے لیے اس خط کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"پٹنہ ضرور تشریف لائیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ تشریف تو لائیں، پر
مجھے خبر نہ کریں۔ آئیے اور یہیں میرے ساتھ ہی قیام فرمائیے۔ راج بھون
میں فقیروں ہی کو رہنا چاہیے۔"

ان خطوط سے ذاکر صاحب کے خلوص اور عقیدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
اب ان خطوط کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں، جن میں مولانا کے اعتراضات کا جواب
ذاکر صاحب نے دیا ہے — خاص طور پر مکتوب نگار کے لہجہ اور اسلوب کو
ملاحظہ فرمائیے۔

مکتبہ جامعہ سے ایک مشہور مستشرق جوزف ہل کی کتاب کا ترجمہ "عربوں کا تمدن"
کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم
کو اس پر شدید اعتراض تھا۔ اس سلسلے میں ماجد میاں کو ذاکر صاحب لکھتے ہیں:-

"میری بدنصیبی کہ ایسے ہی کسی مواقع پر عریضہ ارسال کرنا ہوتا ہے
جب جامعہ والوں کے کسی فعل سے آپ کو دُکھ پہنچ چکا ہو، لیکن آپ کی

شفقت اور مہربانی کا جو اثر دل پر ہے وہ مجبور کرتا ہے کہ جب جامعہ والے
ایسی کوئی بات کریں جس کی ذمہ داری ایک طرح مجھ پر عائد ہوتی ہے تو ضرور
آپ کو لکھوں اور اپنے دل کا حال آپ پر ظاہر کر دوں۔
میں اقرار کرتا ہوں کہ مستشرقین کی کتابوں کے ترجمے کی تجویز میں نے ہی کی
تھی۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں کی کتابیں انگریزی داں لوگ عموماً پڑھتے
ہیں اور ان سے غیر شعوری طور پر بہت متاثر ہوتے ہیں، جواب دینے کی انھیں
اکثر ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور کبھی تو یہ اس کے اہل نہیں ہوتے۔
ایسے لوگ جو مستشرقین کی تصانیف کو پڑھیں اور پھر ان کے رد کی صلاحیت
بھی رکھتے ہوں، نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، لیکن ایسے جو انھیں پڑھ کر
اُردو میں ترجمہ کر دیں بہت کم ہیں۔ پھر اردو میں پڑھ کر ان کا جواب دینے والے
بھی خدا کے فضل سے ابھی مٹے نہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر ہم میں کوئی ایک
جماعت اس کام کے کرنے سے قاصر ہے تو اُسے دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا جائے
میرا یہ خیال صحیح ہو یا نہ ہو لیکن آپ یقین فرمائیں کہ میری نیت بخیر تھی۔"
اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اس لگاؤ اور عقیدت کی بنا پر جو مجھے آپ کی ذات سے ہے، بہت
تکلیف ہوئی کہ آپ کو جامعہ کی ان تحریروں سے دُکھ پہنچا اور اس سے زیادہ
تکلیف اس کی کہ میں خود کسی نہ کسی طرح ذمہ دار ہوں۔ آپ کے اس فقرے
سے کہ "یہ زہر جو آپ لوگ پھیلا رہے ہیں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنوں کے
ایمان کھوکھلے کر کے رکھ دے گا۔" رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ خدا ہم میں
سے کسی کو اس دن کے لیے زندہ نہ رکھے۔ جب ہمارے کسی فعل سے ایک
مردِ مسلم کے ایمان میں ذرّہ برابر کمی پیدا ہو۔"[۱]

بالآخر اس متنازعہ کتاب کی اشاعت روک دی گئی۔ مینیجر صاحب مکتبہ جامعہ کے حوالے سے
ذاکر صاحب ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"اس کتاب کی اشاعت روکی جا چکی ہے اور بغیر تردیدی نوٹ شامل کیے اُسے شائع نہ کیا جائے گا، لیکن اگر نوٹ شامل کر دینے کے بعد بھی اُسے ضائع کر دینے کے قابل سمجھا گیا تو مکتبہ خود ہی اسے ضائع کر دے گا۔ یہ اچھا نہیں کہ جامعہ کسی چیز کو بُرا بھی سمجھے اور اس برائی کو دور کرنے کے لیے اپنے دل میں روپیہ کا لالچ بھی رکھے۔ اسلام پیسے سے زیادہ لائقِ احترام ہے۔"[۵۴]

شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ جامعہ ملیہ اور عربی مدارس کے معیار اور افکار و خیالات میں خاصا فرق تھا۔ جسے مولانا ماجد صاحب نظر انداز کر دیا کرتے تھے اور ہر مسئلے کو صرف اپنی عینک سے دیکھتے تھے۔ ماہنامہ جامعہ میں کبھی کبھار ایسے مضامین چھپ جایا کرتے تھے، جس سے ماجد میاں اور ان جیسے علماء کو اختلاف ہوتا تھا۔ اس طرح کا ایک مضمون "صدائے حق"، کے قلم سے شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب مولانا کے اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں "صدائے حق" کے مضامین کے متعلق گذارش ہے کہ اس قسم کے خیالات اور اس طرح کا استدلال انگریزی خوانوں میں بہت عام ہے اور اب تو عربی اور دینی مدارس کے طلبہ بھی اس سے خالی نہیں۔ پچھلے ۸۔۱۰ برس میں مجھے ایسے بے شمار نوجوانوں سے سابقہ پڑا ہے جو سطحی مطالعہ اور اس سے زیادہ سطحی فکر کی وجہ سے اس قسم کے خیالات رکھتے ہیں لیکن نیک نیتی کے ساتھ میں نے اس کے متعلق خود بھی غور کیا ہے اور اپنے دوسرے جامعی ساتھیوں سے بار بار اس پر مشورہ کیا ہے اور میرا اور میرے ان ساتھیوں کا خیال ہے کہ اصلاح کی بہترین صورت یہی ہے کہ خیالات کے اظہار کا موقع دیا جائے اور ان کی تردید کی جائے یا مسئلے کے دوسرے پہلو روشن کیے جائیں۔ اسی پر بس بھر جامعہ کے درس و ترتیب میں عمل ہوتا ہے اور یہی اصول جامعہ میں مدِ نظر ہے۔ اس پر ضرور اصرار ہے کہ یہ اظہارِ خیال جس کا ہم موقع دیتے ہیں، نیک نیتی سے، متانت سے، تہذیب سے کیا جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ رسالہ جامعہ والوں کے پاس اس قسم کے بہت سے مضامین آتے ہیں، ان میں سے بہت سے شائع نہیں کیے جاتے۔ صرف وہ جو تمسخر، طنز، دل آزار اور خلاف تہذیب باتوں سے خالی ہوتے ہیں، شائع کیے جاتے ہیں کہ اظہار

خیال کی یہی صورت ایسی ہے جس میں جواب دینا مفید ہے۔ ممکن ہے کبھی اندازے میں غلطی ہو جائے، لیکن کوشش یہی ہے کہ تخریبِ دین، بزرگوں کی اہانت، اشتہار بازی، شہرت طلبی کی نیت سے جو مضمون لکھا جائے وہ ہرگز شائع نہ ہو۔"

مولانا ماجد میاں ان لوگوں میں سے تھے جو نئے ذہن کو اپنے دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، صرف یہ چاہتے تھے کہ ایسا کوئی مضمون شائع نہ کیا جائے جو ان کے مخصوص معیار کے خلاف ہو۔ ذاکر صاحب ان کو دعوت دیتے ہیں کہ براہ کرم وہ اپنے خیالات اور دلائل لکھ کر بھیج دیں تاکہ قارئین جامعہ تک ان کی بات بھی پہنچ جاتے، مگر غالباً انہوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔ ذاکر صاحب لکھتے ہیں:

"آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر میں ساتھ ہوتا تو آپ ایک ایک فقرے کی تشریح فرما کر میری زبان سے اقرار کرا لیتے کہ مضمون جاہلانہ ہے تو میرا عین مقصود ہے کہ آپ یہی تشریح نہ صرف میرے لیے بلکہ سب کے لیے کر دیں اور اسے خواہ "سچ" میں یا "جامعہ" میں شائع کرا دیں۔ میرے نزدیک بہتر یہی ہے کہ یہ "تردید" جامعہ ہی میں شائع ہو۔ میں آپ کا عنایت نامہ آنے سے پہلے خود کئی صاحبوں سے درخواست کر چکا ہوں کہ ان مسائل پر کچھ نہ کچھ لکھ کر جامعہ میں شائع کرنے کے لیے دیں۔ اگر تردید آپ کے قلم سے ہوگی تو بہتوں کے خیالات کی اصلاح ہو جاتے گی۔ میری درخواست آپ سے یہی ہے کہ اگر جامعہ میں کوئی قابلِ تردید چیز شائع ہو تو آپ اس کی تردید فرمائیں لیکن جامعہ والوں پر بدنیتی یا سازش کا گمان نہ فرمائیں۔ مجھے جہاں تک علم ہے "صدائے حق" کا کوئی اور مضمون جامعہ میں شائع ہونے والا نہیں ہے۔ انھوں نے جن مضامین کی طرف اشارہ کیا ہے، انھیں غالباً کسی اور رسالے میں چھپوائیں گے۔"[۲۶]

افسوس ہے کہ مولانا ماجد صاحب نے ذاکر صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ محفوظ نہیں رہے، ورنہ ان کے مطالعہ سے ان کے لہجے اور طرز نگارش کا اندازہ ہوتا اور ہماری یہ گفتگو زیادہ معنی خیز ہوتی۔ مگر جہاں تک ذاکر صاحب کے خطوط کا تعلق ہے، ان کی نیازمندی از اوّل تا آخر قائم رہی۔ وہ ہمیشہ مخدوم و محترم سے خطاب کرتے تھے اور آخر میں نیازمند لکھا کرتے تھے۔ یہی روش تاحیات قائم رہی۔

یہ حکایت بہت دلچسپ ہے مگر مزید گنجایش نہیں ہے۔ اب آیئے دوسرے خطوط کے بارے میں بھی باتیں کریں۔

ان خطوط کے علاوہ کچھ خطوط، اُردو کے مشہور محقق قاضی عبدالودود کے نام شائع ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ علم و ادب کی خصوصی خدمت کی ہے اور ایسے لوگوں کی ہر طرح ہمت افزائی کیا کرتے تھے جو علم و ادب کے قدرداں اور ان کے خدمت گزار تھے۔ جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی کی پوری زندگی اس کی گواہ ہے۔ جب وہ گورنر ہو کر پٹنہ گئے تو وہاں قاضی عبدالودود جیسے محقق اور نقاد سے ملاقات ہوئی۔ ملاقات تو پہلے بھی ہوئی تھی اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے بقول اُن سے پہلی ملاقات برلن میں ۱۹۲۳ء میں ہوئی تھی، اس کے بعد ایک دو مرتبہ سرسری ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر اب ایک ہی شہر میں ہونے کی وجہ سے ملاقاتوں اور تبادلۂ خیالات کے مواقع زیادہ پیدا ہو گئے اور گورنری اونچی کرسی اور راج بھون کی سنگین دیواریں دونوں کے درمیان حائل نہ ہو سکیں۔ ذاکر صاحب کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے علم نواز اور ادب و تحقیق کی خدمت کرنے والوں کے کتنے قدرداں تھے۔ ان خطوط میں زبان و تحقیق کے مسائل پر جس بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے ان سے قطعاً اندازہ نہیں ہوتا کہ مکتوب نگار اب جامعہ ملیہ کا بوریہ نشین نہیں، ایک ریاست کا سربراہ اور حکمراں ہے۔ ان خطوط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ زبان و ادب کی جزئیات ذاکر صاحب کی کتنی گہری اور وسیع نظر تھی۔ متعدد خطوط میں انھوں نے اُردو کے املا

طرزِ کتابت اور دوسرے مسائل پر اس طرح لکھا ہے، گویا لسانیات اُن کا خصوصی مضمون ہے
یہ موضوع ذرا خشک ہے مگر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولانا آزاد کی جو کتاب دیکھ رہا ہوں، ان میں اِملے کی یکسانیت
ذرا نہیں ہے۔ مثلاً لیے، لئے، کیے، کئے، دیے، دئے، کہیں
ایک طرح، کہیں دوسری طرح، ایک ہی صفحے کیا، ایک ہی سطر میں ملتے ہیں۔
اسی طرح بخشائش اور بخشایش۔ ستائش اور ستایش۔ شائستہ اور شایستہ۔
یا عقائد اور عقاید ہزاروں جگہ آنے والا لفظ ہوا۔ پھر دل بستگی اور دلبستگی،
گم راہی اور گمراہی۔ طلب گاری اور طلبگاری۔ عالم گیر اور عالمگیر۔ دونوں
طرح ملتے ہیں۔ انہی اور انھیں بھی اسی طرح۔ یہ کتاب ساہتیہ اکادمی کی
طرف سے شائع ہوگی۔ اس میں املا تو ایک لفظ کا ایک ہی ہونا چاہیے۔
جو لفظ اوپر لکھے ہیں، اگر زحمت نہ ہو تو فرمائیں کہ کس طرح کر دینا درست
ہوگا۔ اُردو املا سے متعلق کوئی رسالہ یا مضمون ہو جو ایسے مسائل کے
حل کرنے میں مدد دے تو اس کی نشاندہی فرما دیں۔ شکریہ"[۴۶]

ایک خط میں کتابت کے بارے میں کچھ ہدایتیں یا مشورے دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"خط جس کا نمونہ آپ نے بھیجا ہے، مجھے ناپسند نہیں ہے، خاصا
ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اگر کتاب بہت لمبی نہ ہو تو بجائے اکیس ۲۱ کے
پندرہ ۱۵ سطریں رکھی جائیں تو اچھا ہوگا۔ ایسی حالت میں بین السطور فصل
اتنا رہ سکے گا، جتنا کہ نمونے میں ہے، جو کتابیں طویل ہوں اُن میں اکیس ۲۱
سطریں رکھی جا سکتی ہیں۔ کچھ بہت فرق تو پڑے گا نہیں، سنو صفحے
کی جگہ کوئی ۱۱۰ صفحے ہو جائیں گے۔ اوپر جو دو لکیریں ہیں، ان میں موٹی
لکیر اگر کچھ اور موٹی ہو جائے تو اچھا ہے، لیکن نیچے والی بہت باریک
رہے۔ رنگ کا نمونہ ابھی مکتبہ والوں نے مجھے نہیں بھیجا ہے۔ کتابت
کے نمونے میں مثلاً ہے "میخواہم" کیا اسی طرح رکھنے کا قصد ہے، یا

"می خواہم" ہو جائے گا۔ بہرحال جو فیصلہ ہو، پوری کتاب میں اس کا اہتمام ہو تو بہتر ہے۔ ایرانی مطبوعات میں تو اب غالبًا الگ ہی لکھتے ہیں۔"[۸]

ان کے علاوہ اسی طرح کی اِملا اور طرزِ کتابت کے متعلق کچھ اور باتیں ہیں، مگر طوالت کے خیال سے انھیں حذف کرتا ہوں۔

ایک دو اقتباس ہیں قاضی صاحب کی تحقیق و تنقید کے بارے میں بھی ذاکر صاحب کی رائے ملاحظہ ہو۔ ایک خط میں اُن کی تحقیق اور نظر کی گہرائی کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نوائے اَدب کا نسخہ، جس میں ڈاکٹر اورینوی کے مقالے پر تبصرہ ہے، مجھے مل گیا تھا، نہ جانے آپ کا بھیجا ہوا تھا یا براہِ راست بمبئی سے آیا تھا۔ مضمون پڑھا۔ آپ کی محققانہ نظر کی داد کون نہیں دے گا ـــ تحقیقاتی کام کرنے والوں کو آپ جیسا نگراں مل جایا کرے تو کیا اچھا ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نگراں خود نظر سے محروم ہوتے ہیں اور محنت سے بھی بھاگتے ہیں۔"[۹]

اردو کے ادیب اور محقق اچھی طرح واقف ہیں کہ قاضی صاحب کی تنقید بالعموم بہت سخت ہوتی تھی جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ان سے خفا رہتے تھے۔ ذاکر صاحب قاضی صاحب کے اس انداز اور رویے کو خلوص پر مبنی سمجھتے تھے۔ اس لیے ایک خط میں اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ سچی تنقید سے لوگ برہم ہوتے ہیں لیکن کوئی تو ہو جو انہیں برہم کرے۔ معمولاً تو لوگ شخصی عناد کی وجہ سے برہم کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ علم اور تحقیق کی خاطر برہم کرنا ثواب ہے، اور برہم ہونا گناہ۔"[۱۰]

قاضی صاحب اور ذاکر صاحب کی باہمی ملاقات اور دوستی کا نتیجہ "ادارۂ تحقیقات

اردو" کا قیام اور اس کی تاسیس ہے۔ ذاکر صاحب جیسا علم و ادب اور تحقیق و تنقید کا قدر داں بہار کا گورنر نہ ہوا ہوتا تو شاید یہ مفید ادارہ عالم وجود میں نہ آتا۔

اچھے خطوط کی ایک اہم اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زبان سلیس اور عام فہم ہو اور اسلوب دلکش، ایسا کہ دل سے نکلے اور دل میں اُتر جائے۔ اس معیار پر بھی ذاکر صاحب کے خطوط بڑی حد تک پورے اترتے ہیں۔ جامعہ والوں کی نثر کی خوبی عام طور پر یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ جدید نثر کا بہترین اور قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کے نام لیے جاتے ہیں۔ یہ تینوں میرے استاد ہیں اور ان تینوں بزرگوں کی یکساں اور مساوی عزت کرتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ شگفتگی میں ذاکر صاحب کی نثر اپنے دونوں ساتھیوں سے قدرے بہتر ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اسلوبیات کے ماہر ہیں۔ وہ ذاکر صاحب کی نثر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> ذاکر صاحب کی نثر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چاہے خیال کتنا ہی مجرد اور موضوع چاہے کتنا ہی فلسفیانہ ہو، کیا مجال کہ ان کی نثر میں کہیں سے پیچیدگی یا ژولیدگی پیدا ہو جائے۔ وہ فلسفیانہ مباحث کو بھی ایسی سادگی اور صفائی سے پیش کرتے ہیں، جس طرح سامنے کی باتیں کر رہے ہوں۔"[۱۱]

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں :

> "سادگی سے عام طور پر چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن ذاکر صاحب کے یہاں سادگی کی بنیاد چھوٹے چھوٹے جملوں کے استعمال پر نہیں ۔۔۔ ذاکر صاحب کے جملے خاصے طویل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود نثر پیچیدہ یا مشکل نہیں ہوتی۔"[۱۲]

اُردو کے ایک اور ادیب و نقاد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم لکھتے ہیں :

"ذاکر صاحب ایک صاحبِ طرز ادیب بھی ہیں۔ اس لیے اُن کی شخصیت کی مکمل جلوہ گری ان کی تحریروں کے آئینے میں موجود ہے۔ آدمی صاحبِ طرز اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا، جب تک اس نے اپنی شخصیت کو ایک اکائی میں تبدیل نہ کردیا ہو۔"[13]

یہ تمام خوبیاں ذاکر صاحب کے بیشتر خطوط میں زیادہ بہتر اور موثر انداز میں ظاہر ہوئی ہیں ذاکر صاحب کی ایک خصوصیت کا اب تک ذکر نہیں آیا ہے، وہ یہ کہ احباب کی بے تکلف مجلسوں اور ساتھیوں کے بے تکلف خطوط میں طنز و مزاح کا اظہار بھی مناسب طور پر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے تحریر کی خوبصورتی میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے جان پڑ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک خط خاص طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں جو کافی طویل ہے۔ چونکہ اب تک ذاکر صاحب کے خطوط کے جو اقتباسات پیش کیے ہیں، وہ خاصے مختصر ہیں۔ اس لیے اس طویل خط کو پیش کرنے میں جواز پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے مضمون کا حق بھی ادا ہو جائے گا۔ یہ خط جنیوا سے ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو اس وقت لکھا گیا ہے، جب وہ اپنے علاج کے لیے جرمنی تشریف لے گئے تھے اور دوسری جنگِ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے انتہائی عجلت اور افراتفری میں وہاں سے نکلنا پڑا اور کسی نہ کسی طرح جنیوا پہنچے۔ یہ خط ایسی حالت میں لکھا گیا ہے جب انہیں ذہنی سکون حاصل نہیں تھا۔ پھر بھی یہ خط زبان اور مواد دونوں لحاظ سے اردو کے بہترین خطوط میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو،

HOTEL DES FOMILLAS GENEVA

۱۱ر دسمبر ۱۹۳۹ء

برادرم عابد صاحب! تسلیم

آپ کا خط مجھے اس دن ملا جب میں جرمنی سے بھاگ رہا تھا۔ اسی ڈاک سے ایک خط شفیق صاحب اور ایک خط بیگم صاحبہ کا ملا۔ ان خطوط سے ادھر کا حال اتنا تو معلوم ہو گیا کہ چند ہفتے صبر سے گذار سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کسی

بندۂ خدا نے خبر نہ لی۔ شفیق صاحب نے، مجیب صاحب، اکبر صاحب اور سعید صاحب کے مفصّل خطوط کا حوالہ دیا ہے۔ جو مجھے نہیں ملے۔

میری کہانی سنیے: ۲ر جولائی کو وینس پہنچا۔ شہر پسند آیا، وہیں رہ پڑا۔ دو دن کی جگہ دس دن وہاں رہ گیا۔ بہانہ یہ تراشا کہ اطالوی زبان سیکھ رہا ہوں۔ واقعی سیکھتا بھی تھا لیکن سیکھنے میں جتنی دیر لگی، بھلانے میں اس سے بہت کم لگے گی۔ ۱۸ر جولائی کو ویانا پہنچا۔ وہاں امتیاز آ گئے۔ اُن کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے بوڈا پسٹ چلا گیا۔ بڑا ہی "گھٹا ہوا" شہر ہے، واقعی خوبصورت، تقریباً ہر شخص جرمن بھی جانتا ہے۔ وہاں سے پھر ویانا واپس آئے، مگر ہوائی جہاز پر، یہ ارمان بھی کیوں رہ جائے۔ ویانا سے پھر امتیاز تو چلے گئے اور مجھے ڈاکٹروں کے سپرد کر گئے۔ ڈاکٹروں نے وہ وہ معائنے کیے کہ معاذ اللہ! در گفتن نمی آید۔ قرار یہ پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ ہیں، ٹھیک ہیں، احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا۔ آنتیں البتہ بہت خراب ہیں، پرانی پیچش ہے اور خوب ہے، اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے اور گردے بھی متاثر ہو چلے ہیں۔ زیادہ ڈھیل کی گنجایش نہیں۔ قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہیے تھی۔ لیکن چونکہ یہاں سب کچھ بے قاعدہ رہا ہے، اس لیے ابھی موقع ہے، علاج ہو سکتا ہے۔ خون کی جو حالت ہونی چاہیے تھی، اس سے بہت بہتر ہے، اسی لیے علاج میں سہولت ہے۔ قلب بھی (ستم ظریفی ملاحظہ ہو) پر چاہے ــــ دماغ کا معائنہ نہیں ہوا، ورنہ شاید کچھ دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا۔ علاج سے زیادہ پرہیز کی تاکید کی گئی۔ سات انجکشن تجویز کیے گئے اور حکم ملا کہ کسنجن Kissingen چلے جاؤ۔ وہاں تین ہفتے رہو۔ انجکشن لو، پرہیز کرو، اس کے بعد خون کا معائنہ کراؤ۔ اگر انجکشن کی وجہ سے خون میں کچھ کمزوری آ گئی ہو تو ۴-۵ ہفتے کا وقفہ دے کر پھر انجکشن لینا۔ ورنہ تین۳ ہفتے کا وقفہ

کافی ہوگا۔ چنانچہ میں ۱۵ راگست کو Kissingen پہنچا۔ چھوٹی سی جگہ ہے باشندے سب پردیسی اور بیمار۔ چاروں طرف پھولوں کی بھرمار۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ ویانا سے ڈاکٹر نے ایک مفصل "وصیت نامہ" ساتھ دیا تھا اور ایک اور ڈاکٹر کے نام تعارفی خط۔ انھوں نے اسی دن سے علاج شروع کردیا۔ ایک مکان میں رکھ دیا، جہاں بھٹیارن خود ڈاکٹر تھی اور ایک ڈاکٹر کی بیوہ اور بڈھی یعنی تجربہ کار۔ اس نے پرہیز کا پورا پورا انتظام کیا۔ چند ہی روز میں بین فائدہ محسوس ہونے لگا لیکن فلک کج رفتار کو کیا کہیے، لڑائی کی خبریں آنے لگیں، آدمی، گھوڑے گاڑیاں، موٹریں سب ضبط ہونے لگیں۔ ۲۵ راگست کو سب تیاری ہوچکی تھی۔ ہمارے نوکر سب فوج میں جاچکے تھے۔ بیمار ساتھی سب بھاگ نکلے تھے۔ ریلیں کم ہوگئیں تھیں مگر ہم تھے کہ ڈٹے رہے اور کرتے بھی کیا۔ انجکشن پورے نہیں ہوئے تھے، طبیعت برابر صحت کی طرف مائل تھی۔ ہم نے طے کیا کہ فی الحال جنگ نہ ہوگی۔ اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ راگست کو خاکسار کے بطن سے ایک زندہ وجود تولد ہوا، یعنی ایک عدد عظیم الشان کیڑا، طول جس کا کوئی ۹ را انچ تھا، برآمد ہوا۔ پیچش کے علاوہ یہ بزرگ بھی سالہاسال سے (اندرون خانہ مقیم) موجود تھے۔ انہیں گرفتار کیا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا انھوں نے اس کا لاطینی نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا اور کہا کہ "بہت اچھا ہوا یہ نکل گئے، بہت پرانا ہے۔" خیر یہ بھی ہوا۔ ہم خوش ہوئے کہ علاج کامیاب ہورہا ہے اور جمے رہے۔ پہلی ستمبر کو انجکشن ختم ہوگئے۔ غسل جو تجویز کیے گئے تھے وہ بھی پورے ہوگئے اور دو تاریخ کو اعلانِ جنگ برطانیہ نے کر ہی دیا۔ ہمیں اس روز تک بس یہ معلوم ہوا تھا کہ صلح کی بات چیت ہورہی ہے اور پوری امید تھی کہ پُرامن طریقے پر معاملہ یکسو ہوجائے گا۔ حالتِ جنگ کا اعلان ہمیں ۳ر کو سہ پہر میں سنایا گیا۔ اتوار کا دن تھا۔ اسی وقت اسٹیشن

گیا۔ معلوم ہوا کہ پہلی گاڑی جو مل سکتی ہے۔ وہ صبح ۵ بجے ہے۔ واپس آکر حساب چکایا، سامان باندھا، رات کو دس بجے جاکر سامان اسٹیشن پر دیا اور ٹکٹ خریدا۔ صبح ۵ بجے روانہ ہوگیا۔ ریلوں کا انتظام کچھ یوں تھا کہ ایک حلقے والا دوسرے حلقے کی کوئی خبر نہ دیتا تھا، بس اس حلقے میں گاڑیوں کا حال معلوم ہوسکتا تھا، وہ بھی غیر معین طور پر۔ میں نے سوئٹزرلینڈ کا قصد کیا۔ کہا گیا کہ Stuttgart تک جا سکتے ہو، آگے معلوم نہیں۔ خیر Stuttgart کا ٹکٹ لیا۔ راستے میں تین جگہ گاڑی بدلنی تھی۔ دو دفعہ بدل چکا تھا۔ تیسری جگہ پہنچنے سے پہلے ایک مقام پر بشارت ملی کہ یہ گاڑی نہیں جائے گی۔ سب مسافر اتر جائیں۔ اتر گئے۔ ۸ گھنٹے وہاں پڑے رہے، چھوٹا سا اسٹیشن، ہوائی جہازوں کے ڈر سے تاریک، بس ہر گھنٹہ دو گھنٹے میں ایک گاڑی گزر جاتی تھی، جس میں سرحدی مقامات کے بڈھے بچے ہوتے تھے، جنھیں اندرون ملک بھیجا جارہا تھا خیر یہ وقت بھی گزر گیا، اور ہم Stuttgart پہنچے۔ وہاں کہا کہ Zurich جانا ہے، معلوم ہوا کہ گاڑی ابھی جارہی ہے۔ سامان پوچھا تو معلوم ہوا، ساتھ نہیں آیا ہے — اسی دریافت کرنے میں Zurich کی گاڑی روانہ ہوگئی۔ رات وہیں قیام فرمایا۔ قاعدے سے سرکاری مہمان ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر مہمان نوازی نہ معلوم کیوں نہیں کی گئی۔ دوسرے دن Zurich کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوا۔ جرمن علاقے میں LAKE onstance کے کنارے فریڈرش ہافن پر اترا۔ وہاں سے اسٹیمر لینا ہوتا ہے۔ رات کو پہنچا تھا۔ دوسرے دن ۳ بجے دن کے اسٹیمر جانے والا تھا۔ راستے میں معلوم ہوا تھا کہ اسٹیمر چلنا پھر بند ہو گئے ہیں، آگے نہ جا سکو گے، مگر یہاں پہنچ کر معلوم کہ اسٹیمر پھر چلنے لگے ہیں۔ سہ پہر میں اسٹیمر پر پہنچا۔ جرمن پولیس نے کہا کہ تم کو سوئٹزرلینڈ والے جہاز سے اترنے نہ دیں گے۔ صبح ہی پچاس آدمی۔

اس ساحل سے واپس بھیجے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ جانے تو دیں، میں قسمت آزمائی کر لوں گا۔ مسکراتے، کندھے اچکائے اور پاسپورٹ پر مہر لگا دی۔ میں اسٹیمر پر Romanshom پہنچا، اسٹیمر، جس میں چار سو آدمیوں کی جگہ تھی۔ اس پر عملے کے علاوہ بس تین آدمی اور تھے میں اور دو اور جو فوجی خدمت کے لیے جرمنی سے اپنے ملک واپس جا رہے تھے۔ کپتان نے پوچھا کہ تم نے ویزا لے لیا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ کہا پھر کیسے چلتے ہو، یہ جہاز اسی لیے تو خالی جا رہا ہے کہ کل رات کے بارہ بجے سے ہماری حکومت نے باہر سے آنے والوں کے لیے بلا استثنا ویزا کی قید لگا دی ہے اور اس کی سختی سے پابندی ہو رہی ہے۔ یہ گفتگو اس وقت ہوئی، جب جہاز چل چکا تھا۔ میں نے کہا کہ اب تو میں چل کھڑا ہوا ہوں۔ فرمایا کہ نہیں، واپس جا سکتے ہو۔ پھر اس جہاز پر واپس ہو جانا اور جرمنی میں فلاں مقام پر جا کر ویزا کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ میں نے کہا کہ حضرت، اب یہ تو ہوتا نہیں، ایک دفعہ جرمنی سے نکل کر آنے کے معنی یہ نہیں کہ دوبارہ ان کی مہمانی کی آزمایش کروں۔۔۔

خیر اسی گفتگو میں Romanshom پہنچے۔ وہاں وہی پیش آیا، جو کپتان نے کہا تھا۔ سرحدی پولیس نے کہا کہ واپس جاؤ۔ میں نے کہا کہ ناممکن، یہیں قید کر لو۔ کچھ دیر تو وہ اصرار کرتا رہا کہ حکم تو حکم ہے، واپس جانا ہی ہوگا، مگر جب میری طرف سے بھی انکار ہوتا رہا تو کہنے لگا کہ تم بات تو ٹھیک کہتے ہو، جرمنی واپس جاؤ گے تو تمھیں وہاں قید کر لیں گے، تمھیں واپس بھیجنا ناانصافی ہے۔ میں نے کہا آپ ہی سمجھیے۔ چنانچہ اس نے برن کو ٹیلیفون کیا۔ وہاں سے مجھے اجازت مل گئی اور میں۔۔۔ Zurich پہنچا۔ وہاں برطانوی کانسل نے مشورہ دیا کہ جنیوا جاؤ انگلستان جانے یا اٹلی سے ہندوستان واپس جانے کے متعلق وہیں سے

زیادہ آسانی رہے گی۔ چنانچہ ۹ر کو یہاں پہنچ گیا۔ یہاں ڈاکٹر لگوں سے ملاقات ہوگئی، وہ اتفاق سے اسی ہوٹل میں ہیں، جس میں میں آکر ٹھہرا ہوں۔ اب یہاں اطمینان ہے۔ چند روز کی اس دوڑ بھاگ میں ذرا رنگ و روغن ویسا نہیں رہا جیسا Kissingen میں ہوگیا تھا، مگر فی الجملہ اچھا ہوں۔ خوب سوتا ہوں، خوب کھاتا ہوں اور ہضم کرتا ہوں اور کیا چاہیے۔ وقفہ گزار کر پھر یہیں کہیں انجکشن لینے کا انتظام کروں گا اور اگر اٹلی وغیرہ جاندار رہا تو انشاء اللہ اکتوبر کے ختم تک آپ لوگوں سے آملوں گا۔ مجھے امید ہے کہ روپیہ کی اور ضرورت نہ پڑے گی، لیکن آپ اگر ۲۰۰ پونڈ کا انتظام رکھیں تو اچھا ہے، شاید ضرورت پڑ جائے تو میرا تار ملنے پر آپ بھیج سکیں۔

اس خط کے مضمون سے سب احباب کو مطلع کر دیجیے گا اور یوسف اور محمود کو بھی۔ مجھے یہاں پہنچ جانے کی سب سے زیادہ خواہش اس وجہ سے تھی کہ آپ لوگوں کی خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ دیکھیے یہ قیاس صحیح نکلتا ہے یا نہیں۔"[۱۴]

ذاکر صاحب کے بے تکلف دوست پروفیسر آل احمد سرور تھے جو ذاکر صاحب کی جلوت و خلوت کے رازداں اور ان کی دانش وری اور ان کی علمی و ادبی خدمات کے معترف اور قدرداں ہیں۔ ذاکر صاحب کی ادبی اور علمی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"ہماری گزشتہ پچیس سال کی ذہنی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی، اور ادبی زندگی کے ہر اہم موڑ اور ہر فیصلہ کن لمحے پر ان کے قلم سے تبصرے ہیں، ان کو یکجا کر کے شائع کیا جائے تو ذاکر صاحب کا سرمایہ جو اپنے موضوعات کے تنوع، اپنے افکار کی گہرائی اور اپنے اسلوب کی برگزیدگی کی وجہ سے بڑے بڑے ادیبوں سے کم نہیں ہے، اور بھی بڑا نظر آئے گا۔

زندگی کے اس مجاہد کو قلم ہاتھ میں لے کر یکسوئی سے اپنے افکار کو کاغذ کی نذر کرنے
کی مہلت کب ملی ؟ جو کچھ لکھا، سخت مصروفیت کے زمانے میں، مجبور ہو کر،
راتیں آنکھوں میں کاٹ کر صحت کی خرابی مول لے کر، مگر اس رواداری
میں بھی ہر نقش خون جگر سے بنایا ہے۔ اور اسی لیے اس کی آب و تاب ہمیشہ
قائم رہے گی۔" [۱۵]

مجھے اس اقتباس میں صرف اس قدر اضافہ کرنا ہے کہ ذاکر صاحب کے خطوط بھی اپنی
ادبی اور علمی قدر و قیمت کی بنا پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کے تمام خطوط شائع ہو
جائیں تو نہ صرف ذاکر صاحب کے حالاتِ زندگی پر مفید روشنی پڑے گی بلکہ اُردو کے مکتوباتی
ادب میں بھی قابلِ قدر اضافہ ہو گا۔

حوالہ جات :

۱- ڈاکٹر ذاکر حسین : سہ ماہی اسلام اور عصر جدید۔ ذاکر نمبر۔ خط مورخہ ۱۶ رجون ۱۹۶۲ء
صفحہ ۴۴

۲- ایضاً مورخہ یکم اگست ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۲

۳- ایضاً : مورخہ ۱۱ رجولائی ۱۹۵۷ء صفحات : ۳۹ - ۴۰

۴- ایضاً : مورخہ ۱۰ رجنوری ۱۹۲۹ء صفحات : ۱۹ - ۲۱

۵- ایضاً : مورخہ ۴ ۲ر جنوری ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۲

۶- ایضاً مورخہ ۱۸ رستمبر ۱۹۲۳ء، صفحات ۳۲ - ۳۳

۷- ڈاکٹر ذاکر حسین : خطوط بنام قاضی عبدالودود مرحوم، جرنل خدابخش لائبریری۔
نواں شمارہ ۔ ۱۹۷۹ء خط مورخہ ۶ رجولائی ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۸

۸- ایضاً : مورخہ ۳ راگست ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۵

۹- ایضاً : مورخہ ۲۵ راکتوبر ۱۹۵۸ء، صفحہ ۲۵

۱۰- ایضاً : مورخہ ۲۰ راکتوبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۲۶

۱۱- پروفیسر گوپی چند نارنگ : نقش ذاکر (مرتبہ : عبدالحق خاں) صفحہ ۱۰۶

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۷

۱۳۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، مضمون: ذاکر صاحب کا طرزِ نگارش۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ۔ ذاکر نمبر، بابت ۲۴/ فروری ۱۹۵۷ء، صفحہ ۳۵

۱۴۔ ڈاکٹر ذاکر حسین: خط بنام ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ماہنامہ جامعہ بابت نومبر ۱۹۳۹ء۔ صفحات ۴۷۴۔۴۸۰

۱۵۔ پروفیسر آل احمد سرور: مضمون: ذاکر صاحب کی ادبی خدمات۔ یونیورسٹی گزٹ صفحات، ۳۳۔۳۴۔

حیات اللہ انصاری

ذاکر صاحب اور اردو کے حقوق

ذاکر صاحب کے بارے میں یہ سوال مجھ سے ہر جگہ پوچھا جاتا ہے کہ جب وہ صدر جمہوریہ بن گئے تھے تب انھوں نے اردو کے وہ حقوق کیوں نہیں دلائے جن کے لیے وہ وفد لے کر ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں جب وہ صدر جمہوریہ تھے، گئے تھے۔

اس سوال کے جواب میں میں خود ایک سوال پوچھوں گا۔ ۱۹۷۷ء میں ڈھائی سال تک جنتا حکومت رہی۔ اس میں جتنی پارٹیاں شامل تھیں سب ہی ہندی کی دوست تھیں اور اس کو وہ رابطے کی کل ہند زبان بنانے پر مُصر تھیں۔ اُن کے زمانے میں اتر پردیش میں ایک ہندی ڈے منایا گیا تھا جس میں طالب علموں نے لوگوں کی وہ گھڑیاں اُتروالیں تھیں جن پر انگریزی کے نمبر تھے، اور کاروں کو نقصان پہنچایا تھا کیونکہ ان کے نمبر بھی انگریزی میں تھے۔ وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی ہندی کے زبردست حامی تھے اسی طرح چودھری چرن سنگھ اور اٹل بہاری باجپئی بھی۔ لیکن اس کے باوجود جب جنوبی ہند کی چاروں ریاستوں نے یہ قرارداد پاس کردی کہ ان کی ریاستوں میں ہندی کو لازمی مضمون نہیں بنایا جائے گا اور وہ ہندی کو رابطہ کی زبان کے طور پر استعمال نہیں کریں گی تو مرکزی حکومت کچھ نہ کر سکی — وزیر اعظم اور سب بڑے بڑے لیڈر خاموش ہو گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ لوگ جنھوں نے اندراجی کی مخالفت میں جانے کیا کیا کر ڈالا تھا۔ وہ ان چاروں ریاستو

کے خلاف کچھ نہ کر سکے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جواہرلال جی بھی اردو کے بڑے قدردان تھے اور اردو شاعری کے بہت شوقین۔ جب وہ وزیر اعظم ہو گئے تو انھوں نے ایسوسی ایٹیڈ جرنلس کی ڈائرکٹری سے استعفا دے دیا۔ اس کمپنی سے نیشنل ہیرلڈ نوجیون اور قومی آواز تین اخبار شائع ہوتے تھے، استعفا دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں قومی آواز کا ڈائرکٹر رہ سکتا ہوں۔ جب ریاستوں کی تنظیم کا مسئلہ اٹھا تو مولانا حفظ الرحمٰن کے کہنے سے جواہرلال جی نے کمیشن کے سامنے اردو کا مسئلہ رکھا۔ لیکن بہار اور اتر پردیش کے سب ذمہ داروں نے کہا کہ اگر اردو کو اس طرح اوپر سے نازل کیا گیا تو ہماری ریاستوں میں جن سنگھ کی حکومت بن جائے گی جس کے طرح طرح کے نتیجے تو ہوں گے ہی لیکن ایک یہ بھی ہوگا کہ اردو کو جو کچھ ملا ہے وہ بھی چلا جائے گا۔

جمہوریت میں لیڈر کے لیے صرف ایک حد تک عوام کی مرضی کے خلاف جانے کی گنجائش ہوتی ہے اس سے زائد نہیں۔ زیادہ آگے جانے کے لیے اس کو عوام کا ذہن تیار کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے جمہوریت میں ترقی سست رفتاری سے ہوتی ہے۔

ایسے زمانے بھی گذرے ہیں جب گاندھی جی سے کہا جاتا تھا کہ اب ستیہ گرہ کر دیجیے لیکن وہ کہتے تھے کہ میری اندرونی آواز اس کی حمایت نہیں کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے خیال میں عوام تیار نہیں تھے۔

جمہوریت میں عوام کو اچھے کاموں کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے لیکن زبردست محنت اور گہری سوجھ بوجھ سے۔ اور یہ کام کانگریسی ہی کرتے رہے ہیں۔ اس طرح سے اردو کی اہمیت بڑھائی جاتی رہی ہے سیا اردو اکاڈمیاں اور یہ بہار میں اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کر لینا وغیرہ یہ کام اسی غرض سے کیے گئے یعنی اس طرح لوگوں کے دلوں میں اردو کی جگہ پیدا کی گئی۔

اتر پردیش میں اردو کی مخالفت کا جو عالم ہے اس کا مجھے اندازہ ہے۔
اب ایک سوال اور پوچھا جائے گا اور وہ یہ کہ جب صدر جمہوریہ بھی مجبوریوں سے گھرا ہوا تھا تو ذاکر صاحب نے اس کو قبول کیوں کیا یہ سوال بھی اہم سوال ہے لیکن اس کے جواب میں مَیں پوچھوں گا کہ ذاکر صاحب کو صدر جمہوریہ بنایا کیوں گیا۔ اس زمانے میں اور بھی قابل لوگ موجود تھے۔
بات یہ ہے کہ کانگریسی حکومت مسلمانوں کی اہمیت کو جتانا چاہتی تھی تاکہ فرقہ واریت پر ایک ضرب پڑے۔ ذاکر صاحب اس بات کو سمجھ رہے تھے وہ اگر انکار کرتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ فرقہ واریت کو کمزور بنانا نہیں چاہتے ہیں۔ ان کے اس مرتبہ پر آجانے سے مسلمانوں کا وقار بڑھا اور سیاست کے میدان میں فرقہ واریت کمزور پڑ گئی اور اسی وجہ سے الکشن میں اس کی کامیابی کے امکانات اور کم ہو گئے۔ ٭

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

ڈاکٹر ذاکر حسین اور علاّمہ اقبالؔ

جب دہلی اردو اکادمی کی طرف سے مجھے یہ دعوت ملی کہ مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین اور علاّمہ محمد اقبالؔ کے موضوع پر مقالہ پڑھنا ہے تو میں نے اس کا ذکر، بر سبیل تذکرہ اپنے دو ایک دوستوں سے کیا۔ اُن کا ردِّ عمل یہ تھا کہ اس موضوع پر کیا لکھا جا سکتا ہے — دونوں میں قدرِ مشترک تو کوئی تھی ہی نہیں۔ سیاسیات میں دونوں کے رستے الگ الگ تھے۔ اس پر مجھے اپنے اُن نئے پرانے مقالات کا خیال آیا جن کا موضوع اقبالؔ اور دوسرے اہلِ قلم کا تقابلی مطالعہ تھا مثلاً اقبال اور کانٹ، اقبال اور فختے، اقبال اور شوپن ہائر، اقبال اور کارل مارکس، اقبال اور نیٹشے یا اقبال اور برگساں وغیرہ اور میرے سامنے یہ بات آئی کہ اقبال نے سو فیصد اتفاق تو ان میں سے کسی فلسفی کے ساتھ نہیں کیا۔ خلیفہ عبد الحکیم کے یہ کہنے کے باوجود کہ اقبال نے فلاں خیال نیٹشے سے لیا ہے اور فلاں بات نیٹشے سے متاثر ہو کر کہی ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا نیٹشے کے ساتھ ذہنی بُعد بہت زیادہ ہے اور ذہنی قرب بہت کم۔ اور تو اور اقبالؔ نے سو فی صد تو اپنے پیر و مرشد مولانا روم کو بھی قبول نہیں کیا۔ وہی رومی جن کے بارے میں اقبالؔ نے کہا ہے؛

چو رومی در حرم دادم اذاں من ۔۔۔ ازو آموختم اسرارِ جاں من

بدورِ فتنۂ عصرِ کہن او ۔۔۔ بدورِ فتنۂ عصرِ رواں من

انہی کے ساتھ اقبال کا اختلاف اُس "نے" سے متعلق آخر تک برقرار رہتا ہے جو مثنوی مولانا

ردم میں انجام کار نیستاں کا جزو بن جاتی ہے۔

اس کے بعد میں نے اپنے اور مقالات پر غور کیا جس میں اس طرح کا تقابلی مطالعہ نہیں تھا مثلاً اقبالؔ اور پریم چند' یا 'اقبالؔ اور حسرتؔ موہانی' تو ان میں بھی جو نکتہ میرے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ پریم چند کے متعلق اقبالؔ نے ایک نہایت خوبصورت چھوٹی سی تحریر سپرد قلم کی تھی اور حسرتؔ موہانی کا ذکر اپنے اُس مضمون میں کیا تھا جو انھوں نے "تنقید ہمدرد" کے جواب میں لکھا تھا۔ لیکن ان دونوں مقالوں کی تعمیر انہی دو نکتوں پر تو نہیں اٹھائی گئی تھی۔ اور پھر میرا ایک مقالہ 'اقبالؔ اور جوشؔ' کے عنوان سے بھی ہے۔ اقبالؔ نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام جوشؔ کو سفارشی خط دیا تھا اور جوش صاحب کی علامہ اقبالؔ کے ساتھ دو ایک ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں لیکن مقالے میں ان دونوں باتوں کا ذکر تو ایک جملۂ معترضہ کے طور ہی پر آیا تھا۔ اصل بات جو ان تمام مقالات میں جاری و ساری تھی یہ تھی کہ ایک ہی وقت میں یا ایک ہی طرح کی علمی، سیاسی، سماجی یا فلسفیانہ فضا میں جب دو بڑے فن کار، دو بڑے اہلِ قلم زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے بظاہر متاثر ہوں یا نہ ہوں ماحول کا رشتہ دونوں کے افکار میں خاصی حد تک ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے اور اس کا ان کی تحریروں میں اظہار ہو یا نہ ہو، وہ ہم آہنگی دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیتی ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے تعلّق سے اپنی بات شروع کرنے سے پہلے میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا اور وہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبالؔ کے باہمی تعلقِ خاطر کے متعلّق۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبالؔ میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی، ہاں ۱۹۰۴ء میں دونوں حضرات انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں شریک تھے۔ اگر اسے ملاقات کہا جا سکتا ہے تو صرف یہی ملاقات ان دونوں کے درمیان ہوئی ہے لیکن اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا کہ دونوں کی آپس میں کوئی بات چیت ہوئی یا نہیں۔ یہ وہی جلسہ ہے جس میں خواجہ حسن نظامی بھی موجود تھے اور انھوں نے یہ کہہ کر کہ "تمہارے جام سے کی نذر میری، بارسائی ہوا" اپنا عمامہ

اقبال کے سر پر رکھ دیا تھا۔ غالباً خط و کتابت بھی ان دو نوں عظیم ہستیوں کے درمیان نہیں ہوئی لیکن مولانا ابو الکلام کے بارے میں اقبال کے ایسے تاثرات جا بجا ملتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے دل میں مولانا کے لیے احترام اور محبت کا جذبہ موجود تھا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں مولانا کی رہائی پر اقبال لکھتے ہیں "الحمد للہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی" اسی خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا آزاد اب کہاں ہیں۔ پتا لکھیے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔ ۱۹۱۸ء میں جب "رموزِ بے خودی" شائع ہوئی تو مولانا ابو الکلام آزاد نے اس کی تعریف میں علامہ اقبال کو خط لکھا۔ اس وقت یہ خط تو نایاب ہے اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اقبال کسی کا خط سنبھال کے رکھنے کے عادی نہیں تھے۔ غالباً وہ خط کا جواب دے کر اسے ضائع کر دیتے تھے لیکن اقبال کا خط اس سلسلے میں موجود ہے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام جس میں وہ لکھتے ہیں "آج مولانا ابو لکلام کا خط آیا ہے۔ انھوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو پسند فرمایا ہے اور علامہ کے انتقال پر تو مولانا نے یہ لکھا تھا کہ مرحوم سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اب یہ تعلقات کہیں خطوں کی صورت میں یا مقالات کی صورت میں موجود ہوں یا نہ ہوں، یہ بات اتنی اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں عظیم شخصیتوں نے جو بڑے بڑے کام کیے ان میں ایک کام یہ ہے کہ دونوں نے تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ اقبال کی تو کتاب اس موضوع پر شائع ہوئی The Reconstruction of Religion Thought in Islam کے عنوان سے اور مولانا کی اگرچہ کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں ہے لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خاصا حصہ بلکہ بیشتر حصہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ یعنی The Reconstruction of Religion Thought in Islam ہی کی ذیل میں آتا ہے اور اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو اس بات کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے کہ سیاست میں دونوں کے راستے الگ تھے۔

یہی بات مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین اور علامہ اقبال کی فکری ہم آہنگی کے بارے میں

کہتا ہے یعنی یہ کہ اس بات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں ہے کہ سیاست میں ہمارے ملک کے ان دو عظیم دانشوروں کے راستے الگ الگ تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں فکری ہم آہنگی کتنی زیادہ تھی۔ ہندوستان میں مسلم لیگ کی تشکیل ۱۹۰۶ء میں ہوئی ــ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی نوعیت کے اختلافات اس سے پہلے ہی شروع ہو چکے تھے۔ یہ اختلافات ملک کی اجتماعی زندگی میں رخنہ پیدا کرکے اکثر اپنی صورت دکھا جاتے تھے۔ ہاں تحریکِ خلافت کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا اور بہت مختصر زمانہ جب کہ یہ اختلافات قریب قریب ختم ہو گئے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ اُس وقت ملک کی سیاست میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا طوطی بولتا تھا۔ یہ دونوں سیاسی رہنما مہاتما گاندھی کے ساتھ تھے، چنانچہ دونوں نے ترکِ موالات کے دنوں میں برطانوی حکومت کے بائیکاٹ کی پالیسی اختیار کی۔ گاندھی جی اس زمانے میں علی گڑھ تشریف لے گئے اور اس امر کی انھوں نے بہت کوشش کی کہ علی گڑھ یونیورسٹی برطانوی حکومت کا بائیکاٹ کرے، لیکن اُنھیں کامیابی نہیں ہوئی اور نتیجتاً اُن کے حامیوں نے علی گڑھ کو چھوڑ کر اپنی الگ یونیورسٹی بنانے کا فیصلہ کیا اور وہ یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کرنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین پیش پیش تھے، اور غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ علامہ اقبالؔ علی گڑھ کو چھوڑنے والوں کے ہم خیال نہیں تھے۔ اگرچہ اس وقت یعنی اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ذاکر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر نہیں تھے۔ وائس چانسلر وہ اگلے برس مقرر ہوئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ روزِ اوّل سے جامعہ ملیہ کے روحِ رواں تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب مہاتما گاندھی نے اقبالؔ کو خط لکھا اور اُنھیں جامعہ کا وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی تو اُنھوں نے اس ضمن میں حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ ہی ساتھ ذاکر صاحب سے بھی مشورہ کیا ہوگا۔

اسی ایک واقعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دو عظیم شخصیتیں سیاست میں ایک

دوسرے سے الگ رستہ اختیار کرنے کے باوجود ایک دوسرے کے کمالات کی کس قدر معترف ہوتی ہیں اور تہذیبی دھارے کو اپنے فکر و نظر کی بدولت کس طرح رواں دواں رکھنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔

علامہ اقبالؔ جامعہ کے وائس چانسلر بن کر تو نہ آئے لیکن جامعہ کے ساتھ اُنھیں جو ایک تعلقِ خاطر رہا وہ آج ہماری تاریخ ادب کا ایک حصّہ ہے۔

(۲)

ذاکر صاحب علّامہ اقبالؔ سے بیس برس چھوٹے تھے۔ علامہ اقبالؔ کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۷ء ہے اور ذاکر صاحب کی ۱۸۹۷ء۔ گویا یہ ایک خوردی اور بزرگی کا رشتہ تھا۔ ذاکر صاحب جب اُنیس بیس برس کے ہوں گے تو اس وقت اقبالؔ کی تین چار تصنیفات اُن کی نظر سے گذر چکی ہوں گی ——— علم الاقتصاد 'The Development of Inelaphysics in peina' اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی اور اُن کی بعض اُردو کی معرکہ آرا نظمیں اور غزلیں بھی۔ اور ۱۹۲۱ء میں خضرِ راہ' اور ۱۹۲۲ء میں طلوعِ اسلام بھی شائع ہو گئی تھیں۔ دو برس بعد بانگِ درا چھپ گئی لیکن کلیاتِ اقبالؔ اس سے بہت پہلے چھپ چکی تھی اور وہ بھی حیدر آباد میں۔

یہ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ جامعہ ملیّہ اسلامیہ کے جن بانیوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ علاّمہ اقبالؔ کو جامعہ ملیّہ اسلامیہ کا پہلا وائس چانسلر بنایا جائے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے مہاتما گاندھی سے اقبالؔ کے نام خط لکھوایا تھا اور جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی شامل تھے صرف یہی نہیں کہ علامہ کی سحر آگیں شاعری کے غلغلے سے متاثر تھے بلکہ ان کے افکار، علمی کمالات اور سیاسی نظریے سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ یہ جامعہ ملیّہ کی خوش نصیبی ہے کہ ذاکر صاحب کو جامعہ میں رفقائے کار بھی ایسے ملے جو سرتاپا علمی لگن میں ڈوبے رہے اور زندگی بھر جامعہ کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ یہاں چونکہ بات علامہ اقبالؔ کی ہو رہی ہے مجھے

اِس وقت ذاکر صاحب کے ساتھ ہی مجیب صاحب اور عابد صاحب کا خیال آرہا ہے۔ ۱۹۳۱ء کی بات ہے جامعہ میں جشنِ اقبال کی بات چلی ۔ اس ضمن میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں :

" عابد صاحب اور ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ جرمن یونیورسٹیوں کی طرح جامعہ بھی جشنِ اقبال کے نام سے ایک تقریب منائے جس میں ہندوستان کے اکابر اہلِ علم اور ممتاز شخصیتیں شریک ہوں اور حضرت علامہ کی خدمت میں، جو خود بھی رونق افزائے بزم ہوں گے، متعدد علمی اور فلسفیانہ مقالات کا ایک کشکول بطور اظہارِ عقیدت پیش کیا جائے ۔ لیکن افسوس ہے بعد کے حالات ——— سیاسی ہنگاموں، تحریکِ قانون شکنی اور گول میز کانفرنس کے اعلان وغیرہ کے باعث یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا [1]

سید نذیر نیازی وہ قابلِ قدر شخصیت ہیں جنھوں نے جامعہ ملّیہ میں تعلیم پائی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کے شاگرد رہے۔ علامہ اقبال کے نیاز مندوں میں تھے لہٰذا ان کا تعارف یوں ہونا چاہیے کہ وہ مولوی سید میر حسن کے بھتیجے تھے اور علامہ کی تصنیف Reconstruction of Religion Thought in Islam کا انھوں نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے نام سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب "مکتوباتِ اقبال" میں کئی جگہوں پر یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کی صحت کے بارے میں اکثر پوچھتے رہتے تھے۔

اسی کتاب مکتوبات اقبال میں غازی رؤوف پاشا کی جامعہ ملّیہ میں آمد کا ذکر کرتے ہوئے سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

" ڈاکٹر انصاری مرحوم کے حضرت علامہ سے ذاتی تعلقات تھے۔ انھوں

---

[1] مکتوباتِ اقبال (سید نذیر نیازی) اقبال اکیڈمی کراچی ستمبر ۱۹۵۷ء صفحہ ۷۴

نے اگرچہ اپنی طرف سے بھی حضرت علاّمہ کو تشریف آوری کی دعوت دے رکھی تھی اور بحیثیت شیخ الجامعہ ذاکر صاحب بھی ایک خط لکھ چکے تھے مگر پھر اس کے ساتھ ذاکر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں بھی ایک خط اپنی طرف سے لکھ دوں بلکہ کوشش کروں کہ حضرت علاّمہ جامعہ کی درخواست قبول کرلیں۔ چنانچہ میرا عریضہ حضرت علاّمہ کی خدمت میں پہنچا تو ارشاد ہوا :

ڈیر نیازی صاحب ! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ اگر تبدیلی ناممکن ہے تو بڑی مشکل ہوگی۔ آپ کوشش کریں کہ آخری لیکچر کا روز میری صدارت کے لیے ہو اور آخری لیکچر ۱۸ کو ہو۔ اگر ناممکن ہو تو میں ۱۹۔ مارچ کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۰ کی صبح کو دہلی پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اگر ڈاکٹر انصاری یہ مان جائیں کہ آخری لیکچر ۱۸ کو ہو تو مجھے تار دے دیجیے۔ باقی خیریت ہے۔ ۲۰ مارچ کی صبح (یا جیسی صورت حال ہو) آپ مجھے اسٹیشن پر ملیں۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

۸ مارچ ۱۹۳۳ء

میں نے حضرت علاّمہ کا ارشاد حرف بحرف ذاکر صاحب کو پہنچا دیا۔ ذاکر صاحب بہت خوش تھے مگر اب مشکل یہ تھی کہ اس طرح مرتب کردہ بلکہ اعلان شدہ پروگرام میں کچھ خلل سا پیدا ہو جاتا تھا۔ بالآخر باہمی مشورے کے بعد طے پایا کہ حضرت علاّمہ سے ۱۸ ہی کو تشریف آوری کی درخواست کی جائے اور حضرت علاّمہ نے یہ بھی درخواست منظور کرلی۔ اس اثنا میں ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی طرف سے تو شکریے کا خط لکھ ہی چکے تھے۔ لیکن ۱۶ مارچ کی شام کو حکم ہوا اور ذاکر صاحب نے بھی اصرار کیا کہ میں لاہور چلا جاؤں اور ۱۸ کی صبح کو حضرت علاّمہ کو ساتھ لیے واپس آجاؤں۔ لہٰذا ۱۷ کی صبح

کو میں لاہور پہنچا۔ حضرت علامہ ایک طرح سے منتظر ہی تھے۔ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو اوّل ڈاکٹر انصاری مرحوم اور غازی موصوف کی خیریت مزاج دریافت کرتے رہے۔ اور احبابِ جامعہ بالخصوص ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کا پوچھا۔ باتوں باتوں میں ترکوں اور ترکی کی سیاست کا ذکر آگیا۔"[1]

اس طرح اس کتاب میں ذاکر صاحب اور علامہ اقبال کے تعلقِ خاطر کا ذکر کئی موقعوں پر آیا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری کی دعوت اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذاتی کوششوں کی بدولت علامہ اقبال ۱۸ مارچ کی صبح کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تشریف لے آئے۔ اسی شام کو انھوں نے اُس اجلاس کی صدارت فرمائی جس میں غازی رؤوف پاشا نے وطنیت اور اتحادِ اسلامی کے موضوع پر توسیعی خطبہ ارشاد فرمایا۔ اقبال یوں تو جامعہ کے مہمان تھے لیکن اُن کا قیام ڈاکٹر انصاری کے دولت کدے پر رہا۔ اس ضمن میں سید نذیر نیازی مذکورہ جلسے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غازی موصوف نے خطبہ پڑھا اور محمد اقبال بحیثیت صدر اختتامی کلمات کہنے کے لیے آئے تو غازی موصوف کے خیالات کی رعایت سے اسلام کے مستقبل کا خیال آگیا۔ بے قابو ہو گئے۔ جذبات کا زور تھا۔ تقریر کرتے چلے گئے تا آنکہ "مسجدِ قرطبہ" کے عنوان سے انھوں نے جو نظم لکھی ہے اور جو بہت آگے چل کر "بالِ جبریل" میں شائع ہوئی اس کے اِس شعر

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں

سے ابتدا کرتے ہوئے ایک کے بعد دوسرا شعر پڑھنے لگے تو پھر کیا تھا سامعین وجد میں

---

[1] مکتوباتِ اقبال (سید نذیر نیازی) اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء صفحہ ۹۵، ۹۶

آگئے مجمع ہمہ تن گوش، محمد علی ہال کے گوشے گوشے میں خاموشی ہی خاموشی۔ ایک تو
اُن کا نانزہ کلام دوسرے غازی حسین رؤف پاشا کی محبوب شخصیت، خلافتِ عثمانیہ
کی مجاہدانہ سرفروشیوں کی زندہ یادگار۔ ہر کوئی سوچ رہا تھا ہم کیا تھے کیا ہو گئے حتیٰ
کہ انھوں نے یہ کہہ کر

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

تقریر ختم کی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو طلسمِ خاموشی ٹوٹا۔ شرکائے جلسہ آگے بڑھ بڑھ کر
ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے، اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔[1]

دراصل یہ سارا کرشمہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذاتی کوشش کا نتیجہ تھا کیونکہ اگر وہ
دور اندیشی سے کام لے کر اقبال کو اپنے ہمراہ دہلی لے آنے کے لیے سید نذیر نیازی کو
لاہور نہ بھیجتے تو علامہ اقبال کا ۱۸ر کی صبح تک دہلی پہنچ جانا غالباً ممکن نہ ہوتا۔

(۳)

جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے، ذاکر صاحب نے علامہ اقبال کے بارے
میں کوئی مضمون نہیں لکھا لیکن فکرِ اقبال اور کلامِ اقبال سے اُن کا تعلقِ خاطر اُس
پیغام میں نظر آتا ہے جو انھوں نے "جوہر" کے اقبال نمبر کے لیے مدیر "جوہر" کو بھیجا۔ اس
میں ذاکر صاحب لکھتے ہیں:

"آپ جس شخص کی یاد میں یہ پرچہ نکال رہے ہیں اُس کا کلام ایسا جامع
پیام ہے کہ اگر ہمارے نوجوان اسے سمجھ لیں تو شاید ہماری ملّت کے
دن پھر جائیں . . . . خود اقبال کا ظہور ہماری ملّی زندگی میں ایسا
واقعہ ہے جس سے ڈھارس بندھتی ہے کہ اب رُت بدلنے کو ہے۔ اقبال

---

[1] مکتوباتِ اقبال صفحہ ۹۹، ۱۰۰

ان شاعروں میں سے نہ تھے جو زندگی سے بس لطف اٹھاتے اور اُس
کے گیت گاتے ہیں۔ وہ اُن مسیحا نفسوں میں سے تھے جن کے دم سے
زندگی کی مرجھائی ہوئی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔"

اس دو تین صفحے کے پیغام میں جس بات نے راقم التحریر کو متاثر کیا ہے وہ یہ ہے
کہ اس میں اقبال کی شاعری اور فکر دونوں کی طرف ذاکر صاحب نے بلیغ اشارے کیے
ہیں۔ اُن کی فارسی شاعری کا ذکر بھی آگیا ہے۔ جذبے کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی مقصدیت
کا بھی، خودی کا بھی، بے خودی کا بھی، عقل و عشق کا بھی، وجدان کا بھی اور عقل
کے ادب خوردۂ دل ہونے کا بھی، نورِ حیات کا بھی اور نارِ حیات کا بھی اور ظاہر ہے کہ
اشاروں ہی اشاروں میں ان تمام امور کی عقدہ کشائی اس وقت تک ممکن نہیں جب
تک اقبال کی تمام تصانیف میں قاری ڈوب نہ چکا ہو۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی عقیدت کا یہ عالم تھا
کہ بقول سید نذیر نیازی ۱۹۲۳ء میں جب ذاکر صاحب اعلا تعلیم کے لیے جرمنی تشریف
لے گئے اور دورانِ قیام میں مطبع کاویانی برلین سے دیوان غالب کا ایک منقش اور
اور مطلا نسخہ شائع کیا تو بہ سبب اُس عقیدت کے جو اُنھیں حضرت علامہ سے تھی مجھے
لکھا ــــ " میرا جی چاہتا ہے کہ بانگِ درا کی طباعت بھی اسی اہتمام سے مطبع کاویانی
ہی میں کی جائے۔" لیکن حضرت علامہ کو یہ تجویز پسند نہیں آئی کیونکہ برلین میں
نستعلیق طباعت کا کوئی انتظام نہیں تھا اور حضرت علامہ نستعلیق کو کسی طرح بھی
نسخ پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ عکسی طباعت البتہ ممکن تھی مگر اس کے
مصارف بے حد زیادہ تھے۔ لہٰذا یہ تجویز رہ گئی۔[1]

---

[1] مکتوباتِ اقبال (سید نذیر نیازی) ص ۴

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے راقم التحریر کی بہت کم ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار تو اس وقت جب وہ میری بڑی بیٹی کی شادی پر ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ نئی دہلی میں۔ اُس وقت اُن کی زیادہ تر باتیں والدِ محترم کے ساتھ ہوئیں۔ ایک ملاقات میں اپنی کتاب "اقبال اور اُس کا عہد" کا پہلا ہندوستانی ایڈیشن میں نے اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت اس کتاب کی وجہ سے بات چیت کا موضوع علامہ اقبال ہی رہا۔ اس میں انھوں نے ایک جملہ یہ بھی کہا تھا کہ آپ لاہور والوں نے اقبال کو Monopoline کر لیا ہے۔ اس جملے کے کئی معنی نکل سکتے ہیں اس لیے میں نے جواب میں اتنا ہی کہا کہ اقبال تو مشرق و مغرب کا شاعر ہے کوئی ایک شہر اُسے کیسے Monopoline کر سکتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کتاب کے ابواب پر نظر ڈالی اور ایک باب "کلامِ اقبال کا ہندوستانی پسِ منظر" تھوڑی دیر کے لیے دیکھتے رہے اور مجھ سے کہا کہ اس موضوع پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے اُس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے اور اس طرح کی اور مثالیں بھی کلامِ اقبال میں ملیں تو انھیں بھی اس باب میں شامل کرنا چاہیے ۔۔۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کی شاعری کا یہ پہلو زیادہ تفصیل کے ساتھ اہلِ ملک کے سامنے آئے ۔۔۔ میں نے عرض کیا کہ اقبال کی شاعری کے اس پہلو کو بعض حدود کے اندر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اِس پر زیادہ زور اس لیے نہیں دیا جا سکتا کہ ہم اہلِ ہند اس وقت حب الوطنی اور نیشنلزم کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں حب الوطنی تو ملتی ہے لیکن وہ نیشنلزم کے مخالف ہیں اور اگر زیادہ تفصیل سے لکھا جائے تو ہمیں حب الوطنی اور نیشنلزم میں ایک حدِ فاصل کھینچنا ہوگی۔ اور یا پھر اس کا امکان ہے کہ بات میں

خلطِ مبحث پیدا ہو جائے۔ انھوں نے اس پر سوال کیا کہ خلطِ مبحث کے پیدا ہونے کا کیوں امکان ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ ہمارے بعض اہلِ قلم اقبال کی حب الوطنی کے حدود کو اتنی دور کھینچ کے لے جاتے ہیں کہ وہ اقبال کو اُس تصوّرِ پاکستان سے لاتعلق کر دیتے ہیں جو اُن کے ۱۹۳۰ء والے خطبۂ صدارت میں ہمیں نظر آتا ہے۔ اس پر انھوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک اقبال نے تصوّرِ پاکستان پیش کیا، اب میں نے یہ جواب دیا کہ بعض حضرات اقبال کو تصوّرِ پاکستان سے لاتعلق ثابت کرنے کے لیے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اقبال کے مذکورہ خطبے میں یا اُن کی ساری شاعری میں "پاکستان" کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ تو اُن کی اس دلیل کے پیشِ نظر میں یوں کہوں گا کہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں یقیناً وہ تصوّر پیش کیا جو آگے چل کر تشکیلِ پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اس پر ذاکر صاحب نے قدرے حیرت کا اظہار کیا اور نہ جانے کیسے لیکن بات چیت کا رُخ نیشنلزم اور نیشنلزم کے مغربی تصوّر کی طرف ہو گیا اور میں علاّمہ اقبال کے متعلق اُن کے خیالات اُن کی زبانی سُننے سے محروم رہ گیا۔

(۵)

خیر اوپر کے پیراگراف کو آپ جملۂ معترضہ ہی سمجھیے۔ میں نے اس میں صرف بیانِ واقعہ سے کام لیا ہے، کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش نہیں کی ــ اس سے قبل بات فکری ہم آہنگی کی ہو رہی تھی۔ یہ فکری ہم آہنگی ہمیں علاّمہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین میں زندگی کے اُس شعبے میں نظر آتی ہے جسے ہم تعلیم کا شعبہ کہتے ہیں۔ دراصل علاّمہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین بنیادی طور پر سیاسی آدمی نہیں تھے۔ اگرچہ ذاکر صاحب ہندوستان کے نائب صدر اور صدر کے عہدے تک پہنچے اور اقبال پنجاب مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر رہے، پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے

صدر منتخب ہوئے، الیکشن لڑنے کے بعد لیکن مزاجاً دونوں سیاسی آدمی نہیں تھے۔
تعلیم اور تعلیم کے مسائل سے دونوں کو دلچسپی تھی۔ اگرچہ ان کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں زیادہ لکھا نہیں گیا لیکن انھوں نے اس مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے۔
مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل سے دونوں غافل نہیں رہے۔ بچوں کی تعلیم کو بھی دونوں نے نظر میں رکھا ہے اور چونکہ دونوں ایجوکیشنسٹ بھی تھے اور ایجوکیٹر بھی اس لیے انھوں نے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ اُس کے تمام عملی پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد لکھا ہے۔

بچوں کی تربیت کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے تین تقریریں آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کیں۔ تیسری تقریر میں آپ کہتے ہیں:

> ظاہری ڈسپلن کے بھوت کے بعد مدرسوں کا رائج نصاب بھی بچوں کی تربیت ٹھیک نہیں ہونے دیتا۔ آدمی کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ اس کی بڑی بڑی محرومیاں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ یہ جن چیزوں کو پہلے کسی کام کا ذریعہ بناتا ہے ہوتے ہوتے خود اسی ذریعے کو اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ وسیلہ قریب ہوتا ہے اور مقصد دور۔ بس وسیلہ ہی نظر میں رہ جاتا ہے، مقصد اوجھل ہو جاتا ہے۔

یہ وہ اہم نکتہ ہے جس پر اقبالؔ نے اپنی نظم اور نثر دونوں میں اپنے خیالات کا جا بجا اظہار کیا ہے مثلاً:

آگہی از علم و فن مقصود نیست
غنچہ و گل از چمن مقصود نیست

گویا تعلیم کا مقصد صرف "معلومات" فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ ان کے ذریعے سے اُن صلاحیتوں کو کام میں لانا ہے جو انسان کے اندر موجود ہیں۔ اقبال کے مضمون کا عنوان ہے "بچوں کی تعلیم و تربیت" جس میں وہ لکھتے ہیں:

"جس طرح جسمانی اعضاء تناسب کے اصولوں کے مطابق بڑھتے ہیں

اسی طرح نفس ناطقہ کی نشوونما بھی انہی اصولوں کے تحت میں ہے۔ لہٰذا
طریقِ تعلیم کامل وہی ہوگا جو نفس ناطقہ کے تمام قواعد کے لیے یکساں
ورزش کا سامان مہیا کرے۔ ادراک، تخیل، تاثیر، مشیّت، غرض کہ
نفسِ ناطقہ کی ہر قوّت تحریک میں آنی چاہیئے کیونکہ کامل طریقۂ تعلیم کا
منشا یہ ہے کہ نفسِ ناطقہ کی پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں نہ یہ کہ بہت
سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہوجائیں۔"

جہاں تک تعلیمی مسائل پر بات چیت کا تعلق ہے ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین
دونوں معلّم بھی تھے اور مفکّرِ تعلیم بھی۔ اس لیے بچّوں کی تعلیم سے لے کر بڑوں کی تعلیم
تک کے تمام مسائل پر اُنھوں نے نظر ڈالی ہے اور ان مسائل کے اکثر پہلوؤں پر
دونوں کے افکار میں ایک حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے مثلاً علومِ جدیدہ کے
بنیادی اصول، علومِ جدیدہ کے حصول کی ترغیب و تحریص، تعلیم جدید کی خرابیاں اور
ان میں اصلاح کے طریقے، مقاصدِ تعلیم، علوم طبیعی، علوم عمرانی وغیرہ وغیرہ۔ اس کی
اگر مثالیں تلاش کی جائیں تو دونوں کی تحریروں میں قدم قدم پر ایسی مثالیں مِل
سکتی ہیں۔

ابھی میں نے بچّوں کی تعلیم کے متعلق ان دونوں مفکّرین تعلیم کے خیالات کا ذکر
کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا اس ضمن میں ایک کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں
نے اپنی تمام مصروفیات میں سے وقت نکال کر بچّوں کے لیے ادب تخلیق کیا۔ اقبال
نے شعر میں اور ذاکر صاحب نے نثر میں۔ ذاکر صاحب کی کتاب "ابو خاں کی بکری"
اور اقبال کی نظم "لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری" یا
"ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا ... بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا" یا "اِک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا"
کو بچّے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اگرچہ بچّوں کے لیے ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین
نے زیادہ نہیں لکھا لیکن جتنا بھی لکھا ہے اُس کی حیثیت روشنی کے اُس مینار کی ہے
جو راہ چلتے مسافروں کو راستہ دکھاتا رہتا ہے۔

ایک اور قدرِ مشترک جو ان دونوں کے افکار میں نظر آتی ہے وہ ہے فلسفے کے ساتھ ایک گہرا تعلقِ خاطر۔ اقبال نے تو خیر ایک فلسفی کے طور پر بڑا نام پایا، ڈاکٹر ذاکر حسین کے فلسفیانہ مزاج کو جانچنے کے لیے میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ اُن کے تعلیمی خطبات یا افلاطون کی کتاب "ریاست" کا اُردو ترجمہ اوّل سے آخر تک پڑھیے بلکہ ا ہی کہوں گا کہ ایک نظر اردو ترجمے کے اس مختصر سے مقدمے پر ڈال لیجیے، میری بات کی وضاحت ہوجائے گی۔ آخر ذاکر صاحب نے ترجمے کے لیے اس عظیم کتاب کا انتخاب کیوں کیا۔ ہوسکتا ہے اس کا سبب یہ ہو کہ افلاطون نے "ریاست" میں نظامِ تعلیم کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ آج ڈھائی ہزار برس گزرجانے کے بعد بھی پرانا نہیں ہوا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر فلسفے سے ذاکر صاحب کو دلی رغبت نہ ہوتی اور افلاطون کے نظریات پر اُن کی گہری نظر نہ ہوتی تو ضروری نہیں کہ وہ اِسی کتاب کا انتخاب کرتے۔ ترجمے کے لیے وہ تعلیم کے موضوع پر کسی اور جدید کتاب کو بھی منتخب کرسکتے تھے —— میں اس بات کو علامہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین میں کسی قدرِ مشترک کی موجودگی پر محمول کروں یا نہ کروں لیکن ریاست اور اُس کا مقدمہ پڑھتے وقت مجھے خیال آیا کہ اقبال نے بھی افلاطون کا مطالعہ، فکر کی پوری گہرائی کے ساتھ کیا ہے اور ان کی تصنیف Reconstruction of Religion Thought in Islam میں افلاطون کا ذکر کہی جگہوں پر آیا ہے۔ اب آپ یہ کہیے کہ اقبال نے تو افلاطون کے مسلک کو مسلکِ گوسفندی کہا ہے اور اُس کے متعلق یہاں تک لکھا ہے:

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم ‏ ‏ از گروہِ گوسفندانِ قدیم
رخشِ او در ظلمتِ معقول گم ‏ ‏ در کہستانِ وجود افگندہ سُم

آنچناں افسون نامحسوس خورد　　　اعتبار از دست وچشم وگوش برد
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت　　　خالق اعیان نامشہود گشت

یہاں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اقبال کے یہ سارے اعتراضات افلاطون کے صرف ایک نظریے ـــــ نظریۂ اعیان THEORY OF IDEA پر ہیں اس کے سارے فلسفے اور سارے علم وفضل پر نہیں ہیں۔ اقبال افلاطون کی فلسفیانہ عظمت کے قائل ہیں اور اُن کے اکثر فلسفیانہ افکار کی انھوں نے تائید کی ہے۔ "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں آپ ان چند الفاظ میں افلاطون کو قابلِ ذکر خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں :

"چنانچہ قرآن، مذہب، ریاست، اخلاقیات اور سیاست میں اُسی طرح ایک باہمی ربط بہت ضروری خیال کرتا ہے جس طرح افلاطون نے اپنی تصنیف "ریاست" میں بیان کیا ہے۔"

اسی طرح اقبال کا یہ شعر بھی صرف عورت کے احترام میں نہیں ہے بلکہ اس میں افلاطون کو بھی خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے :

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اور مذکورہ کتاب "ریاست" کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین رقم طراز ہیں :

"سچ یہ ہے کہ اس (کتاب) میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے۔ البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے۔ اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پُر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ فکر وخیال کی دنیا کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ فلسفے کی بلندیاں دیکھنی ہوں تو عینِ خیر میں سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ بھی اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے۔ اخلاق کا سبق لینا ہو تو اس میں روحِ انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق

موجود ہے۔ تعلیم کے مسائل پر روشنی درکار ہو تو بقول روسیو:

"فنِ تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ سب سے بہتر ہے"۔ سیاسی زندگی میں رہنمائی کے لیے یہ ایک جدید ہیئت اجتماعی اور اس کے اداروں کی جیتی جاگتی تصویر لا کھڑی کر دیتی ہے اور انسانی جماعتوں کے تغیر، عروج وزوال کے اسرارِ سربستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو فلسفۂ تاریخ کے مشکل منتطقی مسائل بھی اس میں پانی کر دیے گئے ہیں"۔

توحضرات! اپنی اس مختصر سی تحریر میں اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش میں نے نہیں کی کہ سیاست میں علامہ اقبالؔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے رستے الگ الگ تھے۔ وہ تو خیر تھے ہی لیکن سیاست کی اقدار سے زندگی کی اقدار کہیں بلند ہیں اور اگر زندگی کی اقدار پیشِ نظر ہوں تو نگاہ ہمیشہ ایک دوسرے کے محاسن پر جاتی ہے، اقدارِ مشترک پر جاتی ہے، اختلافات پر نہیں جاتی اور اس وقت انسان کا اپنا کھرا پن ہی اُس کی پرکھ کا پیمانہ بنتا ہے۔ دراصل اقبالؔ اور ذاکر حسین دونوں درویش صفت انسان تھے اور اگر اپنی اس تحریر کو میں اقبالؔ کے ان دو اشعار پر ختم کروں تو بے جا نہ ہوگا:

اے حلقۂ درویشاں، وہ مردِ خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی میں شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

پروفیسر عنوان چشتی

ڈاکٹر ذاکر حسین

دانشِ نورانی و برہانی کا پیکر

اقبال نے دانش انسانی کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ ایک کو دانش نورانی، اور دوسرے کو دانشِ بُرہانی کہا ہے۔ ایک سچے دانشور میں، ان دونوں طرح کی دانشوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ "دانشِ نورانی" کا سرچشمہ آسمانی صحیفے اور "دانشِ برہانی" کا منبع ارضی کتابیں ہوتی ہیں۔ "دانش نورانی" خدا کے کلام سے طاقت، روشنی اور رہنمائی حاصل کرتی ہے جبکہ دانش بُرہانی، عقل، استدلال اور تجزیے بلکہ مادی تجزیے پر انحصار کرتی ہے۔ زندگی ایک پیچیدہ اور بیکراں حقیقت ہے۔ اس کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے دونوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عام طور پر دانشِ نورانی باطن کی سیاحی کرتی اور گوہر مراد پاتی ہے مگر زندگی کے خارجی منظر نامے کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ اسی طرح دانشِ برہانی اگرچہ ظاہر کا تجزیہ کرتی ہے۔ تعقل، تجزیے اور استدلال سے حقیقت کا پتہ چلاتی ہے لیکن باطنی خلاء کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کرتی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس نکتہ سے بخوبی آگاہ تھے کہ زندگی کی بدلتی ہوئی تصویروں اور پیچیدہ نامیاتی سچائیوں کو دانش کے اس وسیع تصور کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے، جو نورانی اور بُرہانی "دونوں، دائروں پر محیط ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی دانش نورانی کا انعکاس اُن کے ملّی اور اسلامی تصورات میں ہوتا ہے اور دانشِ بُرہانی کی جھلک اُن کے قومی اور اجتماعی تصورات میں ملتی ہے۔

ہندوستان ایک رنگارنگ اور متنوّع ملک ہے۔ یہاں جغرافیائی رنگارنگی سے لے کر لسانی، تہذیبی، تمدنی غرض ہر قسم کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسا جامِ جہاں نما ہے جس میں ہمہ رنگ جلوے بے نقاب ہیں اور ہر رنگ کو اپنی صحت اور وجود پر اصرار ہے۔ یہ رنگارنگی، لسانی، مذہبی اور تمدنی سطحوں پر زیادہ ضد کرتی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن اس کثرت میں جو چیز بنیادی قدر کی حیثیت سے نظر آتی ہے، وہ وحدتِ قومی ہے۔ یہ وحدتِ قومی ہماری زندگی کی شریانوں میں خون کی طرح دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جس نے ہندوستانی مزاج میں بقائے باہم، احترامِ انسانیت، امن پسندی اور اتحاد کے جذبات کو بھر دیا ہے۔ بعض شرپسند قوتیں ہمارے ملک کو تکثیر، رنگارنگی یا کثرت کو کمزوری بنا کر پیش کرتی ہیں اور بسا اوقات اس کے دردناک نتائج بھی سامنے آتے ہیں لیکن منافرت کی یہ کیفیت شعلۂ مستعجل ثابت ہوتی ہے اور پھر جلد حالات کا مزاج اعتدال پر آ جاتا ہے۔ اس صورت حال میں جو چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ بقائے باہم اور احترامِ انسانیت کا اصول ہے۔ ان اصولوں کی کمی یا کمزوری سے ہندوستان کے متعدد لسانی، تہذیبی اور مذہبی گروہوں کے درمیان اعتماد کی فضا ختم ہو جاتی ہے اور تضاد و تصادم کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس لیے ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ کثرت و قلت کے نفسیاتی دباؤ سے بالاتر ہو کر ہر شخص کے وجود، اس کی زبان، تہذیب اور مذہب کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ چوں کہ مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں، اس لیے انہیں زندگی کی ہر سطح پر عدمِ تحفظ کا احساس ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۳۵ء میں اس خدشہ کی طرف ان الفاظ میں روشنی ڈالی تھی:

> "ہمارے ماہرینِ تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کر لیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے۔۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں کو،

متحدہ ہندوستانی قومیت سے جو چیز بار بار الگ کھینچتی ہے، اس
میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح
تصوّر قائم نہ کر سکنے کو دخل ہے۔ وہاں اس شبہ کا بھی بڑا حصّہ ہے
کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کو اپنی تمدّنی ہستی کے فنا ہونے
کا ڈر ہے۔ اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں؟

ذاکر صاحب نے جس تمدّنی آزادی اور تمدّنی زندگی کے فنا ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ خطرہ آزادی کے چالیس برس بعد بھی جوں کا توں ہے اور قومی، وحدت کے تصوّر پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ کھلی ہوئی جارحانہ فرقہ پرستی سے قطع نظر جب ہم اس خطرہ کے محرکات پر قومی وحدت کے تناظر میں غور کرتے ہیں، تو قومی سطح پر تین نظریے صاف دکھائی دیتے ہیں، جن کے اپنے اپنے مخصوص نتائج، مضرات اور اثرات ہیں ——— ہندوستان میں ایک طبقہ وہ ہے جو ہر ہندوستانی کے ایک بنیادی دھارے میں ختم ہونے پر اصرار کرتا ہے، اس کی نگاہیں محض ایک زبان، ایک کلچر اور ایک مذہب ہی صحیح قومی وحدت کی تشکیل کر سکتا ہے؟ اس نظریے کے علم بردار ہر ہندوستانی سے ثبوتِ وفاداری طلب کرتے ہیں اور اس کا بھارتیہ کرن کرنے پر بضد ہیں۔ یہ ملک کے نادان دوست ہیں۔ انھیں یہ خیال نہیں آتا کہ ہر شخص کو اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنا ملک، مذہب، غرض اپنے وجود کی داخلی اور خارجی خصوصیات عزیز ہوتی ہیں۔ اس طرح کے مطالبے بداعتمادی پیدا کرتے ہیں اور محبت و یگانگی کی جگہ نفرت اور خوف پیدا کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اپنی لامذہبیت اور مخصوص نظریے کے تحت بار بار اس بات کی تکرار کرتا ہے کہ جملہ مذاہب ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں اور انسانوں کو عقیدوں میں تقسیم کرتے ہیں، جس سے ذہنوں میں قدامت پسندی، توہم اور نفرت کی پرورش ہوتی ہے۔ اس لیے جملہ مذاہب کو جتنا جلدی ہو خیرباد کہنا چاہیئے۔ بلکہ یہ طبقہ ضرورت پڑنے پر یا موقع ملنے پر مذاہب کو تشدّد کے ذریعہ ختم کرنے پر بھی آمادہ ہے۔

یہ بھلے مانس یہ نہیں سوچتے کہ مذاہب نے انسانی تمدن اور اس کی بنیادی اقدار کو جس انداز میں فروغ دیا ہے، تاریخ انسانی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ بات کسی طرح صحیح اور ممکن نظر نہیں آتی کہ یک جنبش قلم یا بیک جنبش تیغ سارے مذاہب کا سرقلم کر کے ایک خالص حیوانی معاشرہ قائم کر دیا جائے اور قومی اتحاد یا عالم گیر انسانیت کا پرچم لہرا دیا جائے — ایک اور تیسرا طبقہ ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ انسان کے مادی وجود کے ساتھ اس کا ایک داخلی، وجدانی اور روحانی وجود بھی ہے۔ جس طرح وہ خارجی وجود کی بقا اور تحفظ کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور اس کے لیے کوشاں رہتا ہے اسی طرح اپنے داخلی، وجدانی اور روحانی وجود کی بقا اور تحفظ اور آزادی کا خواہاں بھی ہوتا ہے — اخلاقی اور تہذیبی اقدار نیز مذہبی عقائد اور افکار اسی کے داخلی وجود کا حصہ ہیں — وہ اپنے طرزِ معاشرت، اندازِ فکر، پیمانۂ اقدار، نظریۂ زندگی، اسلوب حیات اور تہذیبی تصورات سے اپنی جان سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ تقریباً ہر شخص کی یہی سائیکی یا ذہنی کیفیت ہے اس لیے تیسرے طبقہ کے دانشوروں نے صاف طور پر کہا کہ ہر شخص کو نہ صرف یہ کہ اپنے تہذیبی، تمدنی اور مذہبی افکار رکھنے کی آزادی ہے بلکہ اپنی مذہبی عبادتوں اور رسوم کو ادا کرنے کی بھی آزادی ہے — بشرطیکہ وہ دوسرے افراد اور اشخاص کے افکار و عقائد کی اعلانیہ تکذیب اور تذلیل کا باعث نہ ہوں۔ ہر شخص کو اپنی مادری زبان کو پڑھنے اور اپنی تہذیبی خصوصیات نیز تمدنی امتیازات پر پوری شان و شوکت سے عمل کرنے کی آزادی ہے۔ یعنی ہر شخص کو اپنے خارجی وجود کے ساتھ اپنے باطنی وجود کی انفرادیت کو پوری آزادی اور توانائی کے ساتھ باقی رکھنے اور اس کو زیادہ تابناک اور دلآویز بنانے کی آزادی ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ انفرادیت وطنیت اور قومیت سے متصادم نہ ہو، یعنی فرد کی ذہنی و عملی آزادی وطنیت کی قیمت پر نہیں دی جا سکتی۔ اس نظریہ کی اساس یا خلاصہ یہ ہے کہ ہم قومی سطح پر ایک ہیں مگر قوم کے عناصر ترکیبی کی حیثیت سے ہر عنصر کی اپنی الگ شخصیت اور اس کی اپنی امتیازی خصوصیات ہیں۔ نئے ہندوستان کے

تقریباً تمام روشن خیال معماروں نے یہی تصوّر پیش کیا ہے اور اسی کو قومی وحدت کا ذریعہ بتایا ہے۔ جس میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین سبھی شامل ہیں۔ ایسی تصویر ہمارے دستور کی اساس ہے جس نے جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم کے رہنما اصول دیے ہیں ـــ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اسی نقطۂ نظر کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے:

"دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں۔ جن کی بولیاں الگ الگ ہیں رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں۔ عادتیں اور رسمیں جُدا جُدا ہیں۔ مذہب علاحدہ علاحدہ ہیں۔ قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ نظامِ تعلیم کی یکسانیت کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولے میں ان تفرقوں کو بالکل پسِ پشت ڈال دیں۔ یا ہر صوبے اور ہر گروہ کو، جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے۔ اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے، اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہ نکالے[1]"

ذاکر صاحب نے جس لسانی، تمدنی اور مذہبی تکثر اور امتیازات کا ذکر کیا ہے، ان کے باہمی تال میل سے قومی کردار اور مزاج کی تشکیل کی راہ بھی دکھائی ہے۔ جس کو انھوں نے تمدنی اثاثے سے اور افراد کی ذہنی تربیت سے تعبیر کیا ہے۔

اس تصور میں ایک خطرہ پنہاں ہے۔ وہ یہ کہ تمدنی اجزا یا عناصر کی انفرادیت کی لے تیز ہو کر تمدنی کُل کو پارہ پارہ کر سکتی ہے۔ اس لیے لسانی، تہذیبی اور مذہبی اقلیتوں کے وجود کی سالمیت تحفظ اور آزادی کی ضمانت تو ملنی چاہیے، مگر ان میں ایک دوسرے سے اشتراکِ عمل کرنے، ایک دوسرے کا احترام کرنے اور ایک دوسرے سے مل کر ایک متحدہ کُل بننے کی صلاحیت بھی پیدا کرنی چاہیے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس

---

[1] تعلیمی خطبات ص ۲۳۰

کو ہندوستانی دانش وروں نے کثرت میں وحدت کی جلوہ گری سے تعبیر کیا ہے۔
اس ضمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے واضح الفاظ میں لکھا ہے :

"اس طرح کے اجزار کو تمدنی آزادی دے کر وہ متحدہ قوم اور اس کی ریاست کو کمزور تو نہیں کر دیں گے۔ اس لیے کہ اگر اجزار کی اس آزادی کے ساتھ کُل کے ساتھ محبت کا نہایت مضبوط رشتہ قائم نہ ہوا تو بے شک یہ آزادی کُل قوم کے لیے کمزوری اور بعض حالتوں میں ہلاکت کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمارے قومی نظامِ تعلیم کو اس مرکزی خیال کی ترویج کرنی ہوگی کہ جس طرح افراد کی ذہنی نشوونما اور شخصیت کی تکمیل کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنے کو سماج کے تمدن سے نشوونما دیں اور اس کی سیوا کو اپنی ترقی کا ذریعہ جانیں، اُسی طرح ہماری بڑی ہندوستانی سماج میں جو جماعتیں اور چھوٹی سماجیں ہیں، ان میں بھی یہ عقیدہ نہایت پختہ ہونا چاہیئے کہ وہ بھی بحیثیت جماعت اُسی وقت پوری ترقی کر سکتی ہیں، جب کہ بڑی سماج کا اپنے کو خادم جانیں۔ اس کی بھلائی میں اپنی بھلائی اور اُس کی بُرائی میں اپنی برائی دیکھیں[1]۔"

یہاں ذاکر صاحب نے دو اہم اجزائے خیال پیش کیے ہیں۔ ایک یہ کہ تمدنی اجزار یعنی لسانی، تہذیبی اور مذہبی اقلیتوں کے وجود اور ان کی آزادی کا احترام کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ چھوٹے بڑے گروہ یا جماعتیں اور اقلیتیں علیٰحدگی پسندی کے رجحان سے محفوظ رہیں۔ اور بحیثیت جز ایک دوسرے سے اشتراکِ عمل کریں۔ اور کُل کی تشکیل میں اپنی توانائی صرف کریں۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس پر ہندوستانی قومیت کا تاج محل تعمیر ہو سکتا ہے۔

---

[1] تعلیمی خطبات ص۳۶

ہندوستانی قومیت اور ملی تشخص کے جس مسئلہ کی طرف ڈاکٹر ذاکر حسین نے توجہ مبذول کرائی ہے وہ قوم اور ملت کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے مضمرات اور نتائج بہت دوررس ہیں۔ ملت کے تشخص کی تشکیل اگرچہ خالص اسلامی شعائر سے ہوتی ہے۔ لیکن اس میں کچھ تہذیبی اور لسانی رنگ بھی شامل ہے۔ اس لیے مسئلہ ذرا گمبھیر ہو جاتا ہے۔ اسلام کی ایک سطح عقائد کی سطح ہے۔ عقائد خالص ذاتی اور داخلی معاملہ ہے۔ ہر شخص جو عقیدہ چاہے رکھ سکتا ہے۔ ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ بھی اس ضمن میں آزاد اور خود مختار ہے۔ مگر معاملہ عقیدہ سے زیادہ اس کے اظہار کا ہے، اور اس پر عمل کرنے کا ہے۔ اگر مسلمان اپنے مذہبی عقیدوں کے اظہار میں آزاد ہوں، اور مذہبی معاملات عبادات اور رسوم کی ادائیگی میں بے خوف ہوں تو بڑی حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں صرف تہذیبی اور لسانی قدروں اور یادگاروں کے تحفظ اور فروغ کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ سو وہ بھی کوئی جامد حقیقت نہیں۔ اُسے زندگی کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی صداقتوں کی سطح پر، اسلامی اصولوں کی روشنی میں سلجھایا جا سکتا ہے۔ اس مقام پر اس مسئلہ پر قوم کے ارکان اور ملت کے زعمار کو ایک دوسرے سے اشتراکِ عمل کرنا ہوگا۔ ملت کو بدلتے ہوئے سماج میں اسلامی اصولوں کی روشنی میں معاملات پر از سرِ نو غور کرنا ہوگا۔ اور اُن تمام جامد اور فضول اقدار اور اعمال پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی، جو اسلامی اصولوں کی روشنی میں غیر ضروری ہیں اور نئی زندگی میں اپنی معنویت بھی کھو چکے ہیں۔ محض ضد سے کوئی کام نہیں بنتا، اپنے طرزِ فکر و اظہار کو بہت با اصول مگر لچک دار، منطقی مگر سادہ بنانا ہوگا۔ قوم کے ارکان کو مفادِ قوم کے وسیع پس منظر میں اقلیتوں کے لسانی، تہذیبی نیز مذہبی معاملات پر کھلے دل سے غور کرنا ہوگا اور ہمدردی سے ان کے جملہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد کرنی ہوگی۔ غلبہ کی نفسیات اور اخلاقیات سے بلند ہو کر کام کرنا ہوگا — اور ہندوستانی مزاج کے جغرافیائی تکثر، نیز نظریاتی، تمدنی اور لسانی تکثر کا ملی طور پر

احترام کرنا ہوگا۔ اگر قوم وملت کے درمیان افہام وتفہیم اور اشتراکِ عمل اور احترامِ باہمی کی یہ منزل ہو تو بہت سے مسائل خود اپنے آپ حل ہوتے نظر آئیں گے۔

قوم وملّت کے درمیان ہم آہنگی اور ارتباطِ کامل پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں میں عنصری تعلق نہ ہو، بلکہ نامیاتی رشتہ ہو۔ عنصری تعلق میں بہرحال غیریت کا ایسا احساس رہتا ہے، جو دونوں اجزا یا عناصر میں تضاد اور تصادم کے امکان کو بڑی حد تک باقی رکھتا ہے۔ نامیاتی تعلق میں غیریت خارجی اور اضافی ہوتی ہے۔ داخلی طور پر ایسی وحدت ہوتی ہے جو دونوں میں جسم وجان کا رشتہ پیدا کرتی ہے۔ عنصری تعلق کی ابتدا قوم وملّت کے خارجی تصوّر کو پروان چڑھانے اور اس پر ظاہری طور پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ نامیاتی تعلق کی ابتدا، قوم وملت کے تخلیقی اور داخلی تصوّر سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ قوم و وطن دو الگ حقیقتیں ہیں؛ یہ ایک دوسرے کا نعم البدل نہیں۔ اس لیے ارکانِ ملّت سے یہ مطالبہ فضول اور بے معنی ہے کہ ان کے لیے وطن پہلے ہے یا مذہب ــــ موازنہ ایک نوع کی دو چیزوں میں ہو سکتا ہے؛ دو متضاد اور مختلف اشیاء کے درمیان نہیں۔ ایک انسان قوم اور ملّت دونوں کے تقاضوں کو بیک وقت پورا کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے قومی اور ملّی تصوّرات میں اس نکتہ کی خاص اہمیت ہے۔ اسی لیے انھوں نے مسلمانوں کو "مذہبیت کی خارجی اور رسمی" چیزوں کے نقصانات سے خبردار کیا ہے اور اس تصوّر پر ضرب لگائی ہے یہاں ان کا اندازِ فکر اسلامی صوفیوں سے قریب تر نظر آتا ہے، جو زندگی کے ہر مظہر، پہلو، مسئلہ اور معاملہ کو اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ ملّتِ اسلامیہ کو محض "افراد کا اتفاقی اور افادی مجموعہ" تصوّر نہیں کرتے۔ بلکہ اصولی، اخلاقی روحانی اور نامیاتی کل خیال کرتے ہیں۔ اس تصوّر کی جڑیں بھی اسلامی تعلیم میں دور تک چلی گئی ہیں۔ اگر ملت، افراد کا اتفاقی اور افادی مجموعہ ہے تو پھر اس کے سامنے اصول اور ان کا تقدس نہیں ہو سکتا۔ محض اتفاقات اور افادات کسی قوم

کی تقدیر نہیں بنا سکتے، بلکہ اللہ کی زمین پر اللہ کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں ایک عملی اخلاقی اور روحانی اسلوبِ حیات اختیار کرنا ہی سچی اسلامی زندگی ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے لکھا ہے:

"ہم دین کی خارجی رسمیت کی جگہ اُس کی تخلیقی اور تنویری قوت کی طرف بھی آنکھیں اٹھانے لگے ہیں۔ جو ساری زندگی پر حاوی ہو کر اُسے بامقصد اور بامعنی بناتی ہے۔ اور کُل کائنات میں ہمیں ہماری حیثیت اور جگہ بتاتی ہے، اور ایک ایسی دنیا، جو رنگ وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لیے جہنم بن گئی ہے۔ پھر ہم سے اُس حقیقی عدل و مساوات کی فرماں روائی کا پیام سُننے اور اُس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لیے بیتاب ہے۔ جو ایک اُمّی نبی نے دنیا کو سُنایا اور دکھایا تھا۔"[1]

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ذاکر صاحب نے اسلام کی جس تخلیقی قوت کا ذکر کیا ہے، وہ اسلام کی وہی اخلاقی روحانی اور نامیاتی قوت ہے، جس نے انسان اور انسان کے درمیان ہر غیر انسانی رشتے کی نفی کر کے، انسانیت کو خالص انسانی اخلاقی اور روحانی اقدار پر استوار کیا ہے۔ اسلام نے رنگ، نسل، وطن کے بتوں پر ضربِ کاری لگائی اور وحدتِ انسانی کا وہ عظیم تصور پیش کیا، جس پر انسانیت کی تاریخ ناز کرتی ہے۔ سرمایہ و محنت کی معنویت کا پردہ چاک کیا اور دولت بلکہ فطرت کی ہر دین کو انسانوں کا مشترکہ اثاثہ قرار دیا۔ اور اقتصادی انصاف کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھول دیا۔ یہی نہیں بلکہ انسانی مساوات کا وہ ہمہ پہلو تصور دیا، جو زندگی کے ہر شعبہ میں اونچ نیچ کو ختم کرتا ہے اور آزادی، خوش حالی اور مساوات کے یکساں اور منصفانہ نظام کا سنگِ بنیاد ہے۔

---

[1] تعلیمی خطبات ص ۴۶

ذاکر صاحب نے اسلامی اصولوں کی طرف اس مقصد سے توجہ مبذول کی ہے کہ ملت کے افراد اپنے مقام اور منصب کو پہچان کر اپنے فرائض ادا کریں۔ اور قوم وملت کے اتصال وتصادم کے ہر نازک مرحلہ میں ان اصولوں سے روشنی حاصل کرتے رہیں۔ اسلام نے رنگ، نسل اور وطن کے تفرقوں کو بتانِ باطل قرار دے کر ہمیشہ کے لیے قوم اور ملت کے تنازعہ کو ختم کردیا ہے۔ اسلام نے اللہ کی ساری سرزمین کو انسانوں کا وطن قرار دیا ہے، سیاسی یا جغرافیائی حدود کا مسئلہ جس کو عام طور پر وطن کہا جاتا ہے، اور جس کے اندر بسنے والے انسانی گروہوں کو قوم کا نام دیا جاتا ہے، سدا کے لیے حل کردیا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور کہنے کی ہے کہ ملت کے ارکان پر، محض اپنی تشکیل وتعمیر کا فرض ہی عاید نہیں ہوتا بلکہ کُل عالمِ انسانیت کو بنانے اور سنوارنے کی عظیم ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے جس میں قوم ووطن بھی شامل ہے بلکہ قربت کی نسبت سے دوسروں کے مقابلے میں اپنوں کا زیادہ حق ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے واضح الفاظ میں لکھا ہے:

"ہم مسلمان کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں — اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو ہٹانے پر مامور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں، جس میں امیر وغریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کردے، اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقوے کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں، اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، تو اِن سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے۔ جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں۔ اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے[1]"

---

[1] تعلیمی خطبات صـ۵٦

ذاکر صاحب نے اس تحریر کی مختصر گاگر میں اسلامی اصولوں اور وطن کی محبت کا ساگر بھر دیا ہے۔ انھوں نے واضح طور پر ملت کو غلامی کے مقابلے میں آزادی کا، افلاس کے مقابلہ میں خوش حالی کا، عدم مساوات کے مقابلہ میں مساوات کا، رنگ، نسل، وطن کی چھوٹی اور جھوٹی وفاداری کے مقابلے میں عالمگیر انسانیت اور وحدتِ انسانی کا نقیب قرار دیا ہے۔ اور اس میں زمین کے قریبی رشتہ کی نسبت سے وطن کی غیر منقسم محبت کا رنگ بھی بھرا ہے۔ ذاکر صاحب نے یہ لکھ کر "ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقویٰ کی شرافت" پر اصرار کرتے ہیں" گویا ہر باطل تصور اور طاقت کے سامنے انسانی سربلندی اور شرافت کا رجز پڑھا ہے۔ اور بتانِ وہم و گمان کے ہجوم میں اللہ جل شانہٗ کی وحی کی تلاوت کی ہے۔ یا یوں کہیے کہ انسانی عظمت کا قرآنی قصیدہ بہ اندازِ جلی پڑھا ہے۔

ہندوستانی سماج ایک طویل عرصے سے کشمکش، انتشار اور نراج میں مبتلا ہے۔ ہماری قومی زندگی کے افق پر بہت سے رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہے ہیں، جن میں افلاس، تعصب اور جہل کے رنگ بہت گہرے، دور رس اور دیرپا ہیں۔ اس میں دو رائیں نہیں کہ دن بہ دن بڑھتے ہوئے افلاس نے خوش حالی کے خواب کو جھٹلا دیا ہے، تعصب اور فرقہ پرستی نے امن و سلامتی، اتحاد و یگانگت اور قومی ایکتا کی چادر تار تار کر دی ہے۔ جہل کے ناگ علم اور انصاف کی روشنی کو چاٹ رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال نئی نہیں ہے۔ اس کی جڑیں ماضی کی تاریخ میں دور تک چلی گئی ہیں۔ اگر اس تثلیث پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِس کی جڑیں ہماری ذہنی پسماندگی جہالت اور بے علمی میں ہیں۔ اگر علم کی روشنی عام ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ جہل کی تاریکیاں دور ہو جائیں گی بلکہ زندگی کا پورا منظر نامہ صاف دکھائی دے گا۔ اور جس کے آئینہ میں تعصب، تنگ نظری، فرقہ پرستی لسانی اور علاقائی عصبیت سے افلاس، اقتصادی ناانصافی اور پسماندگی کے اسباب و محرکات تک سب کچھ نظر آئے گا۔ یوں تو یہ تینوں بیماریاں ایک دوسرے سے داخلی طور پر مربوط ہیں۔

دانشوروں میں اس پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ ان میں کلیدی اور بنیادی بیماری کون سی ہے۔ ماہرینِ اقتصادیات اور اقتصادی انصاف کے مبلغین افلاس کو، قومی یکتا کے واعظین تعصب اور فرقہ پرستی کو اصل روگ قرار دیں گے۔ لیکن جو لوگ زندگی کی بڑھتی اور پھیلتی حقیقتوں سے واقف ہیں، سائنس اور ٹکنالوجی کی برکتوں اور نحوستوں سے آگاہ ہیں، اور جو علم و عرفان کی سعادتوں کے رمز شناس ہیں، وہ جانتے ہیں کہ زندگی میں ہر منفی عنصر علم کے فقدان اور جہل کے سبب سے داخل ہوتا ہے۔

افلاس، جہل اور تعصب کے زیر سایہ، ہندوستان کا لسانی تہذیبی نیز مذہبی تکثر کا منظر نامہ بہت پیچیدہ اور دقّت طلب نظر آتا ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے کام کا آغاز علم کے نقطۂ روشن سے کیا تھا، اور ملک کے مزاج اور ساخت کو مدِّنظر رکھ کر قومیت کی تشکیل نیز ملّت کی تعمیر کی مخلصانہ کوشش کی تھی۔ اور تعمیری نظریات پیش کیے تھے۔ قوم ان کے لیے ایک وسیع سماج کا درجہ رکھتی ہے جو بہت سی چھوٹی چھوٹی لسانی، تہذیبی اور مذہبی جماعتوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے اندر ہر اقلیت اپنے لسانی، تہذیبی نیز مذہبی افکار و عقائد، رسوم و شعائر کے ساتھ پوری آزادی کے ساتھ سر اٹھا کر چل سکتی ہے۔ جن کا باہمی رشتہ محبت، اخلاص اور انسانیت پر مبنی ہے۔ جو خارجی طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں مگر داخلی یا اندرونی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور اعلا انسانی اخلاقی اور روحانی قدروں سے اکتسابِ فیض کرتی ہیں۔ اس لیے ہر اقلیت، خواہ وہ لسانی و تہذیبی ہو یا مذہبی و نظریاتی، ایک دوسرے کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتی ہے اور ایک وسیع تر قوم کی تشکیل میں ہر سطح پر معاون ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی نگاہ میں قوم و ملّت یا دین و وطن کے درمیان ناقابلِ عبور خلیج حائل نہیں ہے، وہ اگرچہ وطن کا ایک ہمہ گیر تصور پیش کرتے ہیں۔ اور رنگ، نسل اور وطن کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کے خلاف ہیں۔ بنیادی طور پر وہ وحدتِ انسانی اور ایک عالمگیر انسانیت کے مبلغ ہیں۔ اس تناظر میں 'وطنیت' کا مسئلہ مختصر ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ملّت کے تشخص کے مسئلہ پر جن اشاروں سے

کام لیا ہے، ان میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہے۔ وہ ملت کو خیر امت، اشرف المخلوق اور خلیفتہ الرحمٰن کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے "دولت کی شرافت" کے غیر انسانی اور غیر اخلاقی نظریہ کو رد کر کے، تقویٰ کی شرافت کے خالص اسلامی، اخلاقی اور انسانی نظریہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے ملی تشخص کے نقطۂ نظر میں اقلیت۔ کو مذہبی شعائر، عقائد اور معاملات کو اہمیت تو حاصل ہے ہی، ان کی لسانی اور تہذیبی شناخت کو باقی رکھنے پر زور بھی ہے۔ وہ قوم و ملت کے تضاد کے نہیں بلکہ تعلق" دوسرے الفاظ میں نامیاتی ربط کے داعی ہیں۔ اس طرح ان کے قومی اور ملی تصورات میں قوس و قزح کی سی رنگینی ہے۔ جس کی صحت اور افادیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اور آئندہ بھی ان کے نظریات دیر تک اور دُور تک روشنی دکھاتے رہیں گے۔ جن کا سرچشمہ ایک طرف "دانشِ نورانی" اور دوسری طرف "دانشِ برہانی" ہے۔ ٭ ٭

سید ضمیر حسن دہلوی

ڈاکٹر ذاکر حسین کا تصورِ انسانیت

قاضی عبد الغفار نے لکھا ہے :

" آفتاب کی ایک شعاع، مہتاب کی ایک کرن آپ چاہیں کہ اپنی ساری دولت دے کر خرید لیں، تو نہیں خرید سکتے"۔ اعلیٰ انسانی قدریں اس سے بھی زیادہ گراں ہیں یا مفت ملتی ہیں یا نہیں ملتیں۔ دنیا میں ہر چیز کی قیمت لگائی جا سکتی ہے۔ نہیں لگائی جا سکتی تو انسانی شخصیت کی۔ کسی شریف، سچے، بہادر، پاکباز، بے غرض انسان کی، جس نے زندگی کی بہترین قدروں کو اپنایا ہو۔ اُن کو تجربے کی آگ میں تپا کر دیکھا ہو۔ اپنی ساری عمر اُن کی پیروی اور اپنے ہم جنسوں کی سیوا میں بسر کی ہو اور پھر نہ ستائش کی تمنا کی ہو نہ صلے کی پروا، بلکہ اس جنون کی دُھن میں ہر قسم کی مخالفت، بدگمانی، اور اعتراضوں کو جرأت اور خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلا ہو۔ ذاکر صاحب اسی قسم کے انسان تھے۔

آج کی دنیا میں جس کے اوپر تباہی کے بادل منڈلا رہے ہیں اور جس کی بیخ کنی کے لیے اس کے قابل ترین دماغ اس طرح جد و جہد کر رہے ہیں جیسے خودکشی زندگی کی سب سے اعلیٰ قدر ہو، کوئی سبق، کوئی پیغام، فکر کی کوئی یاترا، مذہب کا کوئی اصول اس قدر اہم نہیں جتنا یہ سیدھا سادا، پہاڑوں جیسا پرانا، سمندر جیسا گہرا، سورج جیسا روشن اور گلاب جیسا شگفتہ پیغام کہ اپنے دل اور دماغ کے دروازوں کو کھول دو تاکہ تعصب اور تنگ نظری اور نسلی حسد کے جالے صاف ہو جائیں۔ تاکہ انسان انسان کو اس کے

اصلی روپ میں دیکھ سکے، تاکہ محبت کی دھیمی روشنی اور ٹھنڈی ہوا بند غنچوں کو پھول بنادے؛ تاکہ انسان ایک دوسرے کا خون پینے کے بجائے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بننا سیکھیں، تاکہ علم اور سائنس کی فتح مندیوں نے انسان کو جو بے اندازہ قوت بخشی ہے، وہ انسان کی خدمت کے لیے، تخلیقی جد وجہد کے لیے، زندگی کی گود کو فراغت، خوش حالی اور اطمینان سے بھرنے کے لیے استعمال ہوسکے۔ یہ وہ تعلیمات ہیں جن کی تفسیر خود ذاکر صاحب کی ذات تھی اور یہی وہ گراں قدر ورثہ ہے جو انھوں نے ہندوستانی قوم کے لیے چھوڑا ہے۔

ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے جس کا تسلسل ہزاروں برس سے قائم ہے اور جس کے بنانے میں مختلف قوموں، نسلوں، زبانوں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے۔ تاریخ میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے یونان میں افلاطون، اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی، جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن، ہندوستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد، ذاکر صاحب بھی اسی گنگا جمنی تہذیب کا ایک شاہکار تھے جنھوں نے مشرقی تہذیب اور مغربی علوم کے ماحول میں تربیت پائی اور تعلیم کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا۔ ارسطو نے علم کو روحانی انبساط کا ذریعہ بتایا ہے۔ ذاکر صاحب بھی حصولِ علم کو ہی تعلیم کا مقصد سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے جب تک پوری قوم کے دماغ میں علم اور عقل کے چراغ روشن نہ ہوں گے اور حریم قلب میں انسانیت کا گداز پیدا نہ ہوگا، وہ ایک بہتر سماج بنانے کی تحریک میں کھلے دل سے شریک نہ ہو سکے گی۔

ذاکر صاحب کے تصوّرِ انسانیت کی نقاب کشائی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ذہن کو مروّجہ ضابطہ بندی اور روایتی پیمانوں سے یکسر آزاد کر لیا جائے۔ وہ بڑی سادگی اور صفائی سے "آدمیت" کو خدمت گزاری کے مترادف سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک انسانیت کی کسوٹی یہ تھی کہ آدمی، آدمی کو پہچاننے اور اس کی عزت کرنا سیکھے۔ جمہوری اداروں کا فیضان انھیں اسلامی تعلیمات کے سرچشمے سے حاصل ہوا تھا۔ وہ دل و دماغ کی گہرائیوں سے مسلمان تھے اور باوجود اس کے نہیں، بلکہ اسی وجہ سے وہ بار بار انسانوں کی مشترک

قدروں پر اس کے اٹوٹ رشتوں پر، ان کی فطری اخوت پر زور دیتے رہے۔ ان کے نزدیک کافر اور مسلمان کا اصلی فرق رسمی عقائد کا نہیں بلکہ دل و دماغ کی ساخت کا ہے، زندگی کے بنیادی تصور اور آدرشس کا ہے۔ ان سہاروں کا ہے جن کے بل بوتے پر وہ زندگی کو بنانا اور سنوارنا چاہتے ہیں۔ ایمان کی پہلی شرط یہ ہے کہ خدا کو پہچانا جائے اور اس کے بندوں سے محبت اور ان کی خدمت کی جائے۔ جس شخص نے دل میں عشق کی شمع روشن کرنے کی بجائے اس میں نفرت کے دھوئیں کو جگہ دی اور خدا کے سوا ماسوا سے امید باندھی وہ مومن نہیں ہو سکتا چاہے وہ خود کو کسی نام سے بھی پکارے۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کے لیے ایک صحیح بنیاد اور ایک صالح اصول کا تعین کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خودی کو قائم رکھنے کے لیے ہم جو بھی کام کریں اس میں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم اپنی خودی کا بھی احترام کریں اور دوسروں کی خودی کا بھی۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان اپنی مخصوص انفرادیت کو قایم رکھتے ہوئے، ایک منظم، روادار اور فراخ دل قوم کا ایک فرد ہو جو اپنے تمدنی ورثے اور صلاحیتوں سے عالمی تہذیب کو فروغ بخشے، انھوں نے اپنے عمل سے اس بات کو ثابت کر دکھایا کہ بیک وقت اچھا مسلمان اور اچھا ہندوستانی ہونا نہ صرف ممکن ہی نہیں ناگزیر ہے۔ سیکولر سماج کے ضمن میں یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ آدمی جس طرح اپنے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کا احترام کرتا ہے اسی طرح دوسرے کے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کا بھی احترام کرے۔ گاندھی جی کے آشرم میں گیتا کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت بھی کی جاتی تھی۔ ذاکر صاحب بھی صدر منتخب کیے جانے کے بعد پہلے گاندھی جی کی سمادھی پر پھر جگت گرو شنکر اچاریہ کی خدمت میں آشیرواد حاصل کرنے کے لیے اور پھر منی سوشیل کمار کے پاس ان کی دعائیں لینے گئے تھے۔ مسجد کی محراب کو عام طور پر مسلمان کے قلب کی وسعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو ذاکر صاحب کی مذکورہ عقیدت اور احترام کو پوری مسلم قوم کی طرف سے ایک فرضِ کفایہ کی ادائیگی تصور کرنا چاہیئے۔ یہ عمل انھوں نے مُلک کے سب سے زیادہ برگزیدہ شہری کی حیثیت سے کیا تھا اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان

کے صدر کے لیے اتنے ہی بڑے دل کا مالک ہونا ضروری ہے ۔ بہار کی گورنری کے زمانے میں انھیں پہلی مرتبہ سرکاری اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت سے موقع ملا کہ ہندوؤں کی طرزِ زندگی میں اپنی دلچسپی اور گہرے احترام کا مظاہرہ کریں۔ اس سے بعض مسلمان خوش نہیں ہوئے۔ کچھ لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ اب جبکہ وہ اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں انھیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور مسلمانوں کو وہ سب حقوق مل جانے چاہئیں جن کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہی توقعات ان سے اس وقت بھی قائم کی گئیں، جب وہ نائب صدر اور صدر ہوئے۔ مگر اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر انھوں نے جو رویّہ اختیار کیا وہ تاریخ ساز تھا۔ اپنے بجائے دوسروں کے لیے کچھ کرنا واقعی بڑے حوصلے کی بات ہے اور صدر کی حیثیت سے یہ بات ان کے جانشینوں کے لیے ایک روشن مثال بھی ہے۔ ایک نشانِ راہ جس پر چل کر وہ ایک جمہوری ملک کی سربراہی کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی نظر میں اچھا انسان وہ ہے جو دریا کی طرح سخاوت کی خُو رکھتا ہو، سورج کی طرح فیضان رساں ہو اور دھرتی کی طرح مہمان نواز ہو۔ جو لوگ اسے نقصان پہنچاتے ہوں اس کے بدلے میں وہ ان کے ساتھ فیاضی اور ایثار کا برتاؤ کرے۔ اچھا انسان دوست پیدا کرتا ہے کیونکہ دوستی ہی وہ جلوہ گاہ ہے جہاں خدا اور انسان کے درمیان سچے تعلق کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اچھا انسان بننے کے لیے آدمی اپنے اندر وہ سماجی خوبیاں پیدا کرتا ہے جو اس کے ساتھیوں کو پسند آتی ہیں مثلاً؛ عادت و اطوار میں دل کشی، خوش کلامی، مدلل اور جی کو لگتی ہوئی بات کرنے کی قابلیت، ادب اور آرٹ سے لطف اندوز ہونے کا ذوق اور ایسی تقریبوں میں شرکت جس سے ظاہر ہو کہ اس کے دل میں اپنے احباب کے ساتھ کتنی وابستگی ہے، مقدس اور دین دار لوگوں سے کتنی عقیدت ہے، مساوات پر عمل اس کے لیے ایک حکم کی تعمیل ہی نہ ہوتی بلکہ یہ اس کے مزاج میں رچ کر طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ ایک اچھا انسان صرف خدا سے محبت کرتا ہے لیکن اس طرح کہ وہ لوگ جو اس کے ساتھ رہتے ہیں یہ محسوس کرنے لگیں کہ وہ صرف ان ہی سے محبت کرتا ہے۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ انسان وقتاً فوقتاً اپنے نفس سے محاسبہ کرے اور اپنی ناکامی یا محرومی کا

سبب خود اپنی ذات میں بھی تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ ذاکر صاحب شکوہ سے زیادہ شکرگزاری کو پسند کرتے تھے۔ آزادی کی لڑائی ہو یا سماجی بہبود کا کام انھوں نے ہر میدان میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کی تھی لیکن کسی خدمت کا صلہ نہ چاہا۔ نہایت معمولی مشاہرے پر زندگی بھر کام کرتے رہے اور جب قدرت نے انھیں انعامات سے نوازا تو بھی ان کی شانِ استغنا میں کمی نہ آئی۔ دوسروں کے لیے سب کچھ کرتے رہے اور خود اپنے گریبان کی بخیہ گیری نہیں کی۔ ذاکر صاحب نے فرد کی اصلاح کو معاشرے کی اصلاح سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فرد اس کائنات کا صرف ایک ذرّہ نہیں ہے بلکہ خود انسانیت، اس کی آئندہ امیدیں خواب اور آرزوئیں اس سے عبارت ہیں۔ اس کی خاطر ہمیں ان اقدار کی بار بار جانچ کرتے رہنا چاہیے جو اس کی زندگی کے تانے بانے میں شامل ہیں یہ بات عقل اور انسان کے ذہنی اور اخلاقی معیار سے گری ہوئی ہے کہ حالتِ موجودہ کو صرف اس لیے منظور کر لیا جائے کہ موجودہ حالت ایسی ہی ہے۔ اخلاق کی تعمیر اور تشکیلِ نو کے لیے آدمی کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اس راہ میں تھک کر بیٹھ جانے والے صرف اپنا ہی نہیں پوری نوعِ انسانی کا ناقابلِ تلافی نقصان کرتے ہیں۔

ذاکر صاحب ان لوگوں کو پسند کرتے تھے جن کی طبیعت میں مصائب و آلام سے غصہ کی آگ کی جگہ سوزِ دل کی دھیمی دھیمی گرمی اور درد کی میٹھی میٹھی کسک پیدا ہوتی ہے۔ جو بے صبری سے جھلّانے اور بپھرنے کی جگہ سعیِ پیہم کا عزم کرتے ہیں۔ جو تخریب کی سہل اور ڈھلوان سڑک کی جگہ تعمیر کی دشوار گزار راہ اختیار کرتے ہیں اور دور از کار بظاہر شاندار منصوبوں کی خیالی تخلیق کی جگہ ان پیش پا افتادہ حقیر کاموں کو پورا کرنے میں لگ جاتے ہیں جو ان منصوبوں کے روبرو آنے کی شرطِ اوّل ہیں۔ ہمہ گیر سیاسی اور معاشی اداروں کو قوم کی عام اخلاقی اور ذہنی حالت کا آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان اداروں میں تغیر سے پہلے اس اخلاقی اور ذہنی حالت کو بدلنا ضروری خیال کرتے ہیں جو نئی دنیا کے بنانے کے لیے، نئے آدم کی تخلیق اور نئی تعمیر کے لیے، نئے معماروں کی تربیت لازمی جانتے ہیں۔ جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں کہ بظاہر عظیم الشان ادارے اخلاقی احساس کی کمزوری

سے دیکھتے دیکھتے متزلزل ہو جاتے ہیں اور بظاہر کمزور اخلاقی قوتیں اپنی غیر منطقی توسیعی صلاحیتوں کے باعث عظیم الشان اور غیر متوقع تبدیلیاں پیدا کر سکتی ہیں۔ ذاکر صاحب معلم تھے اور ان کا اصرار تھا کہ مثالی انسان پیدا کرنے کے لیے ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو ہندوستانی رنگ دینا ہو گا وہ کہتے تھے کہ ہمیں چاہیے کہ نوجوانوں کو ان نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں کی صف میں جانے سے روکیں جو خود اپنے فن اور اپنے کلام کے حسن کے معاملے میں اندھے ہیں۔ اپنی موسیقی کے ساز و آہنگ کے باب میں بہرے ہیں، اپنی زبان اور اپنے ادب سے شرمندہ ہیں۔ جن کی نظروں میں ہر وہ چیز جو اپنی ہے گھٹیا ہے پست ہے اور ہر وہ چیز جو باہر کی ہے، اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ تعلیم کو اس حد تک تبدیل کرنا چاہتے تھے کہ نوجوانوں کو اس بات کے لیے مطعون نہ ہونا پڑے کہ اپنے ہی وطن میں رہیں اور زندگی بدیسیوں کی طرح گذاریں۔ اپنے ہی گھر میں رہیں اور اپنی ہی زبان نہ بول سکیں۔ اپنے ہی دیس میں رہیں اور اپنے ہی خیال و افکار کی سمت میں سوچنے سے معذور ہوں اور بقول شاعر ان کے لبوں پر مانگے کی تقریریں ہوں اور دلوں میں مانگے کی آرزوئیں۔ ذاکر صاحب تعلیم کے اس نظام کو پسند کرتے تھے جو ہمہ گیر ہو۔ جو انسان کو اعتماد اور سلیقے سے زندگی گذارنا سکھائے۔ نظریاتی مضامین کے یک رُخے ہجوم کو جس کا ہماری درسیات کے اوپر بے انتہا بوجھ ہے، وہ کم کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں ہر انسان کا علم سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے اسی لیے وہ تعلیمی نظام میں ایسی تبدیلیاں کرنا ضروری سمجھتے تھے جو علم کو شہروں کی حدود سے بڑھ کر، دیہی اور قصباتی سماج تک پہنچائیں۔

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو لینا جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر طرف سے جو کچھ مل سکے لیں اور اسے اپنے ذاتی آرام و آسائش یا قوت و اثر حاصل کرنے کا آلہ بنائیں، دوسرے وہ جن کے دل کی گہرائیوں سے یہ آرزو چھلکتی ہے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ دیں۔ روپیہ، پیسہ، علم، محبّت، خدمت، دل سوزی، ہر چیز — ان کی خودی کو تسکین حاصل ہوتی ہے دوسروں کی زندگی میں روشنی پہنچا کر، ان کا دکھ درد بٹور کر، ان کے راستے کے کانٹے ہٹا کر۔ اس قسم کے خاص مثالی کردار کم ہوتے ہیں،

زیادہ تر لوگوں میں دونوں باتیں ملی جلی ہوتی ہیں۔ وہ لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں لیکن جو لوگ زیادہ حریص ہوتے ہیں ان میں خود غرضی اور نفس پرستی جڑیں پکڑتی ہے اور جو زیادہ فیاض ہوتے ہیں ان میں خدمت اور ایثار کا جلوہ پیدا ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کو قدرت نے فیاضی اور فیض رسانی کی بے اندازہ صلاحیت بخشی تھی۔ انھوں نے ساری عمر، جہاں تک ممکن ہوا لینے کی حرص کبھی نہیں کی اور یہی ان کی نظر میں انسان کی سب سے بڑی سعادت اور فضیلت ہے۔

اہلِ باطن نے گداز قلب اور دردمندی کو لازمۂ انسانیت بتایا ہے۔ حیا، حلم، انکساری اور مروّت آدمیت کے خاص جوہر ہیں۔ کہتے ہیں آدمی کا دل وہ غم برداشت کر سکتا ہے جو پہاڑ پر گرے تو پاش پاش کر دے۔ ذاکر صاحب کا دل بے حد نرم اور رقیق تھا۔ دوسروں کی ذرا سی تکلیف ان کو بے چین کر دیتی تھی لیکن دل کی یہ نرمی کبھی ان کے دماغ یا قوّتِ عمل کو معطل نہیں کرتی تھی۔ بار بار دیکھا گیا کہ اچانک کوئی ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ اور سب لوگ خوف یا غم کی وجہ سے ہراساں ہو گئے لیکن ان کا دماغی سکون متزلزل نہیں ہوا۔ دل کی چوٹ، بے قراری اور دھڑکن کو اپنی قوّتِ ارادی سے دبا کر وہ فوراً ان تدبیروں کو اختیار کرتے تھے جن سے خوف یا خطرہ دور ہو جائے۔ وہ ایک فرشتۂ رحمت تھے جو نہ صرف اپنی ہمدردی سے دکھے ہوئے دلوں کا مرہم بن جاتے تھے بلکہ اپنے حسنِ انتظام سے بدنظمی میں نظم اور بدحواسی میں اطمینان، پیدا کر دیتے تھے۔ ان کے ضبط اور تحمّل کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے جب انھیں اپنی بچی ریحانہ کے انتقال کی اطلاع ملی۔ ذاکر صاحب بچّوں کی ایک تقریب میں مٹھائی بانٹ رہے تھے انھوں نے فوراً وہاں سے رخصت لینی اس لیے مناسب نہ سمجھی کہ بچّوں کی خوشی میں خلل واقع ہوگا اور تقریب کے اختتام پذیر ہونے تک خاموشی سے اس درد کو پی گئے۔ مروّت اور دلداری کے سلسلے میں ایک دوسرا واقعہ یاد آتا ہے جب وہ ایک جرمن خاتون کے گھر دعوت پر گئے اور وہاں خراب ہوئی کلیجی کی پوری پلیٹ صاف کر گئے تھے۔ انھیں بچپن سے ہی ضبطِ نفس کی تعلیم دی گئی تھی۔ ایک بار جب وہ اسکول چھوڑ رہے تھے تو اسکول کے

باقی مولوی بشیر الدین صاحب نے انھیں کھانے پر مدعو کرکے شوربہ میں تھوڑا سا پانی ملادیا تھا۔ اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ آدمی کو زندگی میں راحت کی تلاش نہ کرنی چاہیئے۔ ایک اور بزرگ شاہ حسن نے بھی ان کی تربیت میں حصہ لیا تھا اور انھیں ایسے محرکات پر قابو کرنا سکھایا تھا جن کے ایما پر عام لوگ زندگی کے گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں۔

کسی شخص کی ذات میں ایک سچے معلّم اور ایک سیاسی لیڈر کی صفات کا جمع ہوجانا ایک نادر واقعہ ہے۔ ان دونوں کے تقاضے اکثر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں ــــ سیاسی لیڈر قوّت کا کھیل کھیلتا ہے اور ایک سچّا معلم حسن، خیر، حق اور خدمت کی قدروں کا سیوک ہوتا ہے۔ لیڈر لوگوں کی جا اور بے جا ناز برداری کرتا ہے تاکہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکر قوت اور رسوخ حاصل کرے۔ معلّم نامقبول لیکن صحیح خیالات کی حمایت اور غلط تحریکوں پر تنقید کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے خواہ اسے اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے لیکن جب کوئی سیاسی لیڈر بے نفسی کے ساتھ کام کرتا ہے اور صرف مادّی ترقّی ہی نہیں بلکہ قوم کے اخلاق اور ذہن کی تربیت کو اپنا مقصود بناتا ہے تو معلّم اور مدبّر کے بیچ کی حدیں اٹھ جاتی ہیں اور افلاطون کا "فلسفی بادشاہ" وجود میں آتا ہے۔ یہ ایک عینی تصوّر ہے جس تک پہنچنا بہت مشکل ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ذاکر صاحب کی ذات میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے انسان کے مستقبل کو امید کی آنکھوں سے دیکھا تھا اور باوجود ان تمام ناکامیوں اور پسپائیوں کے جو حق دوستوں کے نصیب میں آتی ہیں انھوں نے یاس پسندی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ کہتے تھے "میں نے دنیا کی تاریخ میں بار بار انسان کو شہید اور مصلوب ہوتے دیکھا ہے لیکن میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اس کی امر روح بار بار سر اٹھاتی ہے اور ہر برائی پر فتح پاتی ہے۔"

ایک انگریز مصنّف کا قول ہے کہ "بعض لوگ پیدائشی بڑے ہوتے ہیں بعض اپنی کوشش سے بڑائی حاصل کرتے ہیں اور بعض پر بڑائی زبردستی لادی جاتی ہے۔" دُنیا میں اکثریت تیسرے قسم کے بڑے لوگوں کی ہے اور یہی وہ گروہ ہے جو دوسروں

بر عافیت کے راستے بند کر دیتا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ وہ اپنی محنت سے پھل حاصل کرتے ہیں اس لیے قابلِ تعریف ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ جن کی پیشانی پر بچپن ہی سے بلندی کا ستارا روشن ہوتا ہے شاذو نادر ہی پیدا ہوتے ہیں کیونکہ قدرت جو اوسط اور گھٹیا نمونے بنانے میں بہت مشّاق اور فیّاض واقع ہوئی ہے اعلیٰ نمونوں کی تشکیل میں بہت جزرسی سے کام لیتی ہے۔ سچّی عظمت حاصل کرنے کے لیے ایک بڑی شرط یہ ہے کہ فرد میں بڑا بننے کی فطری صلاحیت ہو اور پھر وہ اپنی محنت اور کوشش سے ان صلاحیتوں کے جوہر کو اُبھارے۔ جب وہب اور کسب کا قران السعدین ہوجاتا ہے اس وقت انسانِ برتر کی تشکیل وجود میں آتی ہے۔ ذاکر صاحب کی ذات میں یہی امتزاج پایا جاتا تھا۔ انھوں نے قدرت سے غیر معمولی صفات پائی تھیں لیکن وہ اس میراث پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ گئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم، محنت اور جفاکشی، تفکّر اور تدبّر کے ذریعہ اپنی فطرت کے سونے کو کندن اور اپنے دماغ کی روشنی کو شعلۂ برق بنادیا تھا۔ ان کے کس کس کام اور کس کس خیال کا ذکر کیجیے۔ ذاکر صاحب کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے کارناموں سے بھی زیادہ بڑے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا نیک لوگوں کی برکت سے قائم ہے جو صاحبِ ایمان ہیں اُن کا تو عقیدہ ہی یہ ہے لیکن عام لوگ بھی زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں یہ برکت صرف انھیں لوگوں کے دم سے نہیں جو آج زندہ ہیں۔ ان میں بڑا حصّہ ان لوگوں کا ہے جو اپنی برکت، روشنی اور خوشبو کی طرح بکھر کر خدا کو پیارے ہوگئے۔ نیکی اور شرافت، محبّت اور خلوص، خدمت اور دلنوازی کسی انسان کے نحیف اور فانی جسم کی قیدی نہیں ہے اس کا اثر عناصر کی قید کو توڑ کر بھی قائم رہتا ہے اور وہ حسن، خیر اور صداقت کی میراث کا جزو بن جاتی ہے جو انسان کی سب سے بڑی دولت ہے، سچ تو یہ ہے کہ کسی نعمت کی پوری قدر و قیمت اس سے محروم

ہونے کے بعد ہی معلوم ہوتی ہے۔ آدمی اپنے عمل اپنے کردار، اپنے کارناموں
اور اپنے افکار کے روپ میں تادیر زندہ رہتا ہے۔ بقول ساحرؔ کے:

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مر جانے سے انسان نہیں مر جاتے

صفدر نقوی

بچوں کے ادیب، ڈاکٹر ذاکر حسین

ایک مرغی، ایک مرغا، ایک بطخ اور ایک تیتر اجمیر جا رہے تھے۔
راستے میں لومڑی ملی۔
تیتر سے بولی "رام رام بابو کری کا کا۔ یہ آج اس وقت کدھر کو چلے؟"
تیتر بولا "او ہو! کیا پوچھتی ہو۔ بڑی ضرورت کا کام ہے۔ اجمیر شریف جا رہا ہوں۔ نہیں تو ساری دھرتی اجاڑ ہو جائے گی؟"
لومڑی کو ہنسی تو آئی۔ مگر اسے دبا گئی اور پوچھنے لگی۔ "بابو کری کا کا۔ تم سے یہ کس نے کہا؟"
"بی قیں قیں نے"
"اور بی قیں قیں تمہیں یہ خبر کہاں سے ملی"
"میاں ککڑوں کوں سے"
"اور میاں ککڑوں کوں۔ تمہیں پتہ کیسے چلا"
"بی کٹ کٹ کٹاک سے"
"اور بی کٹ کٹ کٹاک۔ تم سے کس نے کہا؟"
مرغی بولی "مجھ سے کون کہتا۔ میں نے خود خواب دیکھا ہے۔ خود"
کیوں بھئی! تم نے ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام سنا ہے، ہاں بھئی وہ ہمارے راشٹرپتی تھے۔ یہ بات چیت ان کی ایک کہانی "مرغی اجمیر چلی" کا ایک حصّہ ہے۔

ذاکر صاحب ہمارے راشٹرپتی یعنی ہماری جمہوری حکومت کے صدر تھے۔ بہت بڑے ماہرِ تعلیم تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ پھر بہار کے گورنر اور ہندوستان کے نائب صدر رہے۔ آخری عمر میں صدر بنے اور جب دنیا سے گئے تو صدر ہی تھے۔ انھوں نے بہت بڑے کام کیے۔ ان بڑے کاموں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ بچوں کے لیے کہانیاں لکھتے تھے۔

ہندوستان میں کہانیاں لکھنے اور کہنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ پنچ تنتر کی کہانیاں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ سنسکرت کی ان کہانیوں کا ترجمہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے ــــ لیکن اردو میں کہانیاں لکھنے کا رواج بہت پرانا نہیں ہے۔ اب سے کوئی ساٹھ ستر سال پہلے تک بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے کو چھوٹا کام سمجھا جاتا تھا ـــــ بچوں کے لیے کچھ نظمیں تو لکھی گئی تھیں لیکن کہانیوں کا میدان بالکل خالی تھا۔ جامعہ ملیہ کے لوگوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی رہنمائی میں اس خیال سے بغاوت کی۔ چھوٹے کام کو اپنایا اور اسے بڑا کام کر دکھایا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور وہیں استاد ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے استادوں اور طلبا کو انگریزی اسکولوں اور کالجوں سے باہر آنے کے لیے کہا۔ ذاکر صاحب بھی ان لوگوں میں تھے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے باہر آگئے، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد بنے۔ جامعہ اس وقت علی گڑھ کی ایک کوٹھی میں قائم کی گئی تھی۔ بعد میں ذاکر صاحب اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے جرمنی چلے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر آئے جامعہ اب دہلی آ گئی تھی اور قرول باغ کی چند کوٹھیوں میں چل رہی تھی۔ آئے تو شیخ الجامعہ بن کر اور جامعہ کو خوب ترقی دی۔

مکتبہ جامعہ کی طرف سے بچوں کا ایک رسالہ نکالا گیا۔ اس کا نام ہے پیامِ تعلیم۔ اسی پیامِ تعلیم میں ذاکر صاحب کی کہانیاں چھپا کرتی تھیں۔ شروع شروع میں ذاکر صاحب

کی کہانیاں ان کی بچی رقیہ ریحانہ کے نام سے چھپا کرتی تھیں۔ اس بچی کا انتقال چھوٹی عمر ہی میں ہو گیا۔ بعد میں ان کی کہانیاں ان کے اپنے نام سے چھپنے لگیں۔

مکتبہ جامعہ نے بڑوں کے لیے بھی بہت سی اچھی کتابیں چھاپی ہیں۔ لیکن بچوں کے لیے کتابیں چھاپنا مکتبے کا خاص کام تھا۔ جامعہ کے لوگ بچوں کے لیے کہانیاں لکھتے تھے اور مکتبہ ذاکر صاحب کی سرپرستی میں انھیں چھاپتا تھا۔ اس طرح پچھلے تقریباً ساٹھ سال میں جامعہ اور مکتبہ جامعہ کی وجہ سے اردو میں بچوں کے ادب کو خوب ترقی ہوئی۔

ذاکر صاحب کی ایک کتاب نیشنل بک ٹرسٹ نے چھاپی ہے۔ کتاب کا نام ہے "ابو خاں کی بکری" اس کتاب میں کل پندرہ کہانیاں ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ زیادہ تر کہانیاں جانوروں کی ہیں۔ ذاکر صاحب کے یہ جانور آدمیوں کی طرح سوچتے ہیں۔ آدمیوں کی طرح بات چیت کرتے ہیں۔ آدمیوں کی طرح اچھائی اور برائی کا فرق پہچانتے ہیں۔ آدمیوں ہی کی طرح عقل سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بے وقوفی سے نقصان۔ کبھی کبھی آدمی اپنے کردار کی مضبوطی کی وجہ سے دنیاوی طور پر نقصان اٹھاتا ہے لیکن کسی بڑے مقصد یا اصول کے لیے اس کی یہ قربانی فائدہ ہے یا نقصان، دیکھنے یا پڑھنے والے خود ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں ـــــ کہانی 'ابو خاں کی بکری' میں ایک بکری ہے۔ جس کا نام چاندنی ہے۔ چاندنی پہاڑ کی آزاد فضاؤں میں رہنا چاہتی ہے، لیکن ابو خاں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس کے دانے اور پانی کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ بکری جانتی ہے کہ پہاڑ پر بھیڑیا بھی ہے۔ لیکن آزادی کی خاطر گھر سے بھاگ کر اوپر پہاڑ پر پہنچ جاتی ہے۔ اور اس آزادی میں بہت خوش ہے۔ رات آتی ہے اور بھیڑیا بھی آجاتا ہے۔ چاندنی یہ جانتے ہوئے بھی کہ جیتنا مشکل ہے پوری رات بھیڑیے سے لڑتی رہتی ہے۔ اور آخر صبح ہوتے ہوتے ـــــ لیکن ٹھہریے کہانی کا انجام ذاکر صاحب کے الفاظ میں سنیے ـــ

بکری سوچتی ہے:

"—— میں نے اپنے بس بھر مقابلہ کیا۔ اب تیری مرضی"۔ موذن آخری دفعہ اللہ اکبر کہہ رہا تھا کہ چاندنی بے دم زمین پر گر پڑی۔ اس کا سفید بالوں کا لباس خون سے بالکل سرخ تھا۔ بھیڑیے نے اسے دبوچ لیا اور کھا گیا۔

اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اس پر بحث ہو رہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی۔ سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا، ایک بوڑھی سی چڑیا ہے۔ وہ مصر ہے کہ چاندنی جیتی۔"

ایک دوسری کہانی کا نام ہے "عقاب" ذاکر صاحب کا یہ عقاب پہاڑ کی چوٹی پر ایک درخت پر ایک گھونسلے میں رہتا ہے۔ صبح کو شکار کے لیے نیچے اترتا ہے اور پیٹ بھر کر پہاڑ کی چٹانوں پر اپنا وقت گذارتا ہے۔ ایک دن ایک بلی کا بچہ پکڑ لاتا ہے۔ اسے کھاتا نہیں پال لیتا ہے۔ کچھ ہی دن میں بلی کا بچہ اس ماحول سے اکتا جاتا ہے۔ اور اسی لبستی میں واپس جانے کی ضد کرتا ہے۔ عقاب اسے واپس پہنچا دیتا ہے لیکن خود پکڑا جاتا ہے۔ بلی کا بچہ چاہتا ہے کہ عقاب ایک پالتو جانور کی طرح اس کے ساتھ رہے۔ لیکن عقاب زنجیر توڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔ اپنے گھونسلے میں واپس پہنچ کر کہتا ہے —" خدا کا شکر ہے کہ پھر آ پہنچا اپنے وطن میں، پھر پالیا اپنا دیس۔ تو اکیلا ہی رہنے کو بنا ہے۔ بس اکیلا ہی رہ۔ تیرے ساتھی اگر ہیں تو یہی ستارے، یہی چٹانیں۔"

ذاکر صاحب کی کہانیوں کی زبان اتنی ہلکی پھلکی اور دلچسپ ہے کہ کہانی ختم کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی۔ ان کہانیوں سے ہم اچھی باتیں سیکھتے ہیں لیکن نصیحتوں کی بھر مار کے بغیر۔ یوں کرو، اور یوں نہ کرو، ان کی کہانیوں میں نہیں ملتا۔ کرداروں کی اچھائی یا برائی سے پڑھنے والا خود ہی اثر لیتا ہے۔ اور یہ اثر سیدھی نصیحت کے مقابلے میں کہیں زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کی کہانی میں بات آدمی نے کہی ہو یا جانور نے یا کسی اور چیز نے سیدھی دل پر جا لگتی ہے۔ ایک اور کہانی میں چھدو ایک لڑکا ہے۔ وہ آسمانوں میں اڑنا چاہتا ہے۔ سمندروں میں تیرنا چاہتا ہے۔ اور آخر گھوڑے پر دوڑتا ہے، پرندے کے ساتھ اڑتا ہے، مچھلی کے ساتھ

سمندر میں غوطے لگاتا ہے۔ اور بادل کے ساتھ ہوا پر تیرتا ہے۔ ماں اس کے نہ ملنے سے سخت پریشان ہے۔ اس وقت کی سنئیے :

— "ایک کالا کالا بادل اس کی طرف لپکا اور قریب آکر چھدّو کو اپنی گود میں لے لیا۔ اس کی گود بڑی ٹھنڈی ٹھنڈی تھی۔ اور ایسی نرم جیسے حلوا۔ بادل چھدّو کو گود میں لے کر جو چلا تو چھدّو کو ایسا لگا جیسے اس کے گالوں پر دو بوندیں گریں۔ دو بڑی بڑی گرم گرم بوندیں۔ چھدّو کچھ اداس ہو گیا اور کہنے لگا۔ یہ تو ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے میری ماں کے آنسو ہوں — بادل نے بتایا — ہاں بیٹا یہ تیری ماں کے آنسو ہیں۔ وہ تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی تھی اور ایک جگہ بیٹھی رو رہی تھی کہ میں پاس سے گذرا تو یہ دو آنسو ساتھ لیتا آیا — اب یہ کیسے ممکن تھا کہ چھدّو اپنی ماں سے دور رہ سکتا — اس نے بادل سے درخواست کی اور بادل نے اسے اس کی ماں کے پاس پہنچا دیا —"

ذاکر صاحب زندگی بھر مصروف رہے۔ جامعہ اور علی گڑھ کے معاملات، ملکی معاملات میں سیاست دانوں کو مشورے — بہت سی انجمنیں وغیرہ۔ غرض مصروفیت بہت زیادہ تھی — انھیں لکھنے کا اور خاص طور پر بچوں کی کہانیاں لکھنے کا وقت بہت کم ملتا تھا۔ انھوں نے بہت تھوڑی سی کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن جتنی لکھی ہیں وہ بہترین ہیں — ہر کہانی پوری طرح مکمل ہے۔ دلچسپی کے لحاظ سے بھی، افادیت یعنی فائدہ مند ہونے کے لحاظ سے بھی۔ اور دل پر اثر چھوڑنے کے لحاظ سے بھی۔

ایک بہت اچھے استاد کی حیثیت سے وہ بچّوں کے ادب کو بچّوں کے لیے

بہترین دوست اور رہنما بننا چاہتے تھے اور اس میں پوری طرح کامیاب رہے، خود لکھ کر بھی اور دوسروں کی ہمت افزائی کے ذریعے ادب کو ترقّی دے کر بھی۔

ڈاکٹر فرحت حسین

ذاکر صاحب کی نثر

قومی منظر نامے میں ذاکر صاحب اُس وقت سامنے آتے ہیں جب خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کے دوران علی برادران اور گاندھی جی نے طلبا سے انگریزی تعلیم کی درس گاہیں چھوڑ دینے کی اپیل کی۔ اس اپیل پر لبیک کہتے ہوئے ۱۹۲۰ء میں جن لوگوں نے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کو خیر باد کہا اور قومی نظریۂ تعلیم کی تدریس کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا، ان میں ذاکر صاحب پیش پیش تھے۔ اس تاریخی واقعہ نے ذاکر صاحب کے لیے قومی سطح کی بلندی تک پہنچنے کا راستہ ہموار کیا اور ان کی فکر و نظر کا رخ تعلیم و تدریس کی عملی زندگی کی جانب موڑ دیا۔ ذاکر صاحب کی عمر کا زیادہ حصہ تعلیم و تعلم میں گزرا۔ ان کی ہمہ گیر پرکشش شخصیت کے تار و پود میں جامعہ کی علمی و عملی وسیع دنیا کا بڑا دخل ہے۔ ان کی انسان دوستی، نرم دلی اور انسانی اقدار کی پاسداری کے جذبات نے یہیں سے رخت سفر باندھا۔ ان کی درویشانہ صفات، سادگی و پاکیزگی اور خلوص کا دریا یہیں سے موج زن ہو کر سمندر بنا۔ اور یہیں سے ان کی بالغ نظری، حب الوطنی اور سماجی شعور کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ ابلاغ و ترسیل ان کی شخصیت کی جبلت تھے اور گفتار و کردار معلمی کے غماز تھے۔ سمجھانے کا انداز ہو یا حکم دینے کا طریقہ، جوش و ولولے کا اظہار ہو یا بُردباری و سنجیدگی کا عالم، ان کے ہر عمل میں درس کی کیفیت، علم کی چاشنی اور عمل کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔ ایک اچھے معلم کی یہی شان اور پہچان ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب نے اقتصادیات و معاشیات کی

اعلا تعلیم حاصل کی تھی، عملی زندگی نے جہاں اُنھیں ماہرِ تعلیم کا اعزاز عطا کیا وہاں قومی مسائل اور ملکی معاملات میں اس طور پر الجھائے رکھا کہ ملکی تاریخ میں تو ان کا نام صدرِ جمہوریہ کی حیثیت سے روشن ہو گیا لیکن ان کی معلمانہ بصیرت کے جواہر ریزوں کو صفحۂ قرطاس پر تحلیل ہونے کا ایسا موقعہ نہیں دیا کہ ان کی جامعیت سے علم کا ایک نیا سورج وجود میں آسکتا۔ اس کم وقتی کے باوجود ذاکر صاحب نے اردو ادب کی خاموش اور ٹھوس خدمت کی۔ وہ ادب کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کو عبادت سمجھتے تھے۔ انھوں نے جامعہ میں اردو اکیڈمی کی بھی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کی رہنمائی میں برلن سے دیوانِ غالبؔ، رباعیاتِ عمر خیام اور دیوانِ شیداؔ کے خوبصورت ایڈیشن شائع ہوئے۔ دیوانِ غالبؔ نسخۂ برلن کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سابق صدر شعبۂ اُردو سینٹ فلومینا ز کالج میسور نے لکھا ہے :

"ایک مرتبہ وہ (یعنی ذاکر صاحب) میری چھوٹی سی لائبریری کی طرف جانکلے۔ وہاں کاویانی پریس برلن کا چھپا ہوا دیوانِ غالب رکھا ہوا تھا۔ اس کی طرف لپکے اور کہا اچھا یہ آپ کے پاس ہے، میرے جرمنی کے قیام ۱۹۲۳ء میں میں نے اس کے حروف اپنے ہاتھ سے جوڑے تھے۔ اب نہ میرے پاس ہے نہ جامعہ ملیہ میں۔ اور دیر تک اس کی ورق گردانی کرتے رہے۔" (حنائے علی گڑھ)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کو اردو سے کتنی محبت تھی۔ انھوں نے اردو ادب کی جس طور پر خدمت کی اردو دُنیا اُس کو بھلا نہیں سکتی۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ذاکر صاحب کو جو مقام معلم کی حیثیت سے حاصل ہوا وہ ان کے مصنف ہونے کی حیثیت کے مقابلے میں زیادہ بلند رہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ قومی اور ملکی ذمہ داریوں نے انھیں اپنے علمی تبحر اور دیدہ ورانہ جامعیت کو قلم بند کرنے کی بہت کم فرصت دی۔ ذاکر صاحب نے بہت کم لکھا اور جو لکھا وہ بھی کسی علمی یا ادبی شناخت کے لیے نہیں بلکہ تعلیم و تربیت اور سماجی فلاح و بہبود کے مقصد سے لکھا، قومی اور ملکی تقاضوں کے خیال سے لکھا۔ اس لیے ذاکر صاحب کی تحریروں میں خواہ انشاپردازی کی شان نہ پائی جاتی ہو یا ان میں ایسی خصوصیت نہ ہو کہ انھیں ادیب کا درجہ دیا جا سکے

لیکن ان کی تحریروں میں نثر نگاری کا وہ سنجیدہ اسلوب اور طرزِ بیان میں واضح اظہار کی ایسی رعنائی و توانائی ضرور پائی جاتی ہے جو کسی بھی نثر پارے کے لیے افتخار و وقار اور زندۂ جاوید رہنے کی ضامن ہوتی ہے۔ آل احمد سرور نے لکھا ہے:

"انھوں نے کتابوں میں کبھی اپنے آپ کو بند نہیں کیا۔ مگر جب کبھی کچھ لکھا تو اپنے خلوص، دل سوزی اور سماجی شعور کی وجہ سے الفاظ میں وہ پسی ہوئی بجلیاں بھر دیں جن کی وجہ سے ادب میں آب و تاب آتی ہے جن سے انسانوں کی زندگی بدلتی سنورتی اور نکھرتی ہے۔ (علی گڑھ گزٹ۔ ذاکر نمبر)

الفاظ میں پوشیدہ پسی ہوئی بجلیاں اور حقیقی مفہوم کا دل آویز و دل کش اندازِ بیان ذاکر صاحب کی تحریر کا خاص وصف ہے۔ وہ اچھے نثر نگار تھے اور معلم ہونے کی وجہ سے اچھے خطیب اور مقرر بھی۔ مختلف علوم پر ان کی ہمہ گیر نظر تھی۔ ان کی تصانیف کا بنیادی مطمح نظر تعلیم ہے اور قاری کی حیثیت ان کی نظر میں ایک ایسے شاگرد کی ہے جسے وہ علم سے بہرہ ور کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ابلاغ مقصد اور اظہارِ بیان میں تدریس کا جذبہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اندازِ بیان بات چیت جیسا ہے، زبان عام فہم اور سادہ۔ ذاکر صاحب کا اسلوب تحریر کا نہیں بلکہ معلم کا لیکچر معلوم ہوتا ہے جس میں خلوص کی جھلک اور مقصد کی چاشنی ہے۔ ذاکر صاحب زبان کے توسط سے اپنے خیالات کا جس خاص انداز میں اظہار کرتے ہیں وہی انداز ان کے اسلوب کا امتیاز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلوب مصنف کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کی نثر میں سلاست بیان، پر کشش روانی اور خلوص و صداقت کی تاثیر، اپنی بات کے واضح اظہار پر قدرت، بات دل سے نکلے اور سننے والے کے دل میں بیٹھ جانے والی کیفیت، فکر کی تابانی، علمی بصیرت کی روشنی، سوز و گداز اور سادگی و پرکاری سب خصوصیات مل کر ان کی معلمانہ شخصیت کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

ذاکر صاحب کا تصنیفی سرمایہ اتنا نہیں ہے کہ انھیں ایک بڑے ادیب یا نثر نگار کا مقام دینے کے لیے ان کے نثری اسلوب کا رشتہ اردو کی کسی نثری روایت سے جوڑا جائے۔

سرسید نے اسلوب کے لیے جس روایت کی داغ بیل ڈالی تھی اس میں علوم وفنون کے جذب سے جس روشنی کا انعکاس ہوتا ہے اس کی آب وتاب اور قوت وتوانائی کا لوہا آج بھی مانا جاتا ہے۔ بعد میں اسلوب کے اور رنگ بھی سامنے آئے۔ ان پر انفرادیت کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس پر دوسرا نقش نہیں بنایا جاسکتا۔ ذاکر صاحب کی نثر میں خطیبانہ انداز ہے لیکن مولانا آزاد جیسی فصاحت وبلاغت نہیں ہے۔ نکتہ سنجی اور ظرافت کی چاشنی ہے لیکن رشید احمد صدیقی کی طرح ابہام وکنایہ نہیں۔ تحریر میں آزادیِ رائے، استدلال اور علمیت کے پہلو ہیں لیکن اظہارِ بیان میں نیاز فتحپوری جیسی رومانیت نہیں۔ اس پس منظر میں ذاکر صاحب کی نثر اس معنی میں روایتی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی سادگی، سلاست، روانی، خلوص کی تاثیر، مقصدیت، سوز وگداز، علم وعرفان اور وضاحتی کیفیت اس روایت سے مناسبت رکھتی ہے جسے سرسید حالی اور مولوی عبدالحق نے پال پوس کر پروان چڑھایا۔ ادب کے ان بزرگوں کے نقشِ پا کی آہٹ ذاکر صاحب کی نثر میں سنی جاسکتی ہے۔ ذاکر صاحب ادیب نہیں تھے لیکن ادب کا پورا شعور رکھتے تھے۔ تقریر کا آہنگ، تحریر کی روانی اور تدریس کی تاثیر ان کے اندازِ بیان کے خاص اوصاف ہیں۔ یہ اوصاف ان کی نگارشات کی دلکشی، تاثیر اور رنگارنگی کو بڑھاتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی تحریر کا تخاطب صیغۂ غائب نہیں ہوتا۔ ان کا ذہن مخاطب کا تصور اور قلم موشگافیاں کرتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر معلم تھے۔ علم وادب کو انسانیت کی اعلا اقدار کی خدمت کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ وہ اسی کا درس دیتے تھے۔

ذاکر صاحب کے قلم کی موشگافیاں بہت کم تعداد میں تصنیف کی شکل اختیار کرسکیں۔ اردو میں ان کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں مبادی معاشیات، ریاست اور معاشیاتِ قومی، انگریزی سے اردو ترجمہ ہیں۔ ترجمہ خواہ تخلیق کے ضمن میں نہ آتا ہو مگر مترجم کا اندازِ بیان اور زبان سے کام لینے کا سلیقہ، ترجمے کو تخلیق کے قریب لے آتا ہے۔ ذاکر صاحب کے ان تراجم کے اندازِ بیان میں موضوع کے اعتبار سے انتہائی درجے کی متانت، سنجیدگی اور فلسفیانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے احتشام حسین

کی یہ رائے ہے:

"نثر نگاری کا وہ سنجیدہ اسلوب جس کا ایک رنگ تنقید میں نمایاں ہوا، ایسی علمی اور فلسفیانہ تحریروں میں بھی ظاہر ہوا جو ہلکے پھلکے انشائیوں سے الگ پروان چڑھ رہا تھا۔ اس کے اچھے نمونے مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، رشید احمد صدیقی اور یوسف حسین خاں کی تحریروں میں مل جاتے ہیں"۔ (عکس اور آئینے)

ذاکر صاحب کے علمی اور سنجیدہ اسلوب کے لیے افلاطون کی کتاب "ریاست" کا اردو ترجمہ بہ نسبت ان کے دوسرے تراجم کے زیادہ جاندار اور پر مغز ہے۔ یہ کتاب مکالموں میں ہے۔ زبان شستہ اور سلیس ہے اور ذاکر صاحب نے افلاطونی باتوں کو عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔ لیکن اس اہتمام کے باوجود لہجے کی افلاطونیت کی وجہ سے عبارت کی روانی مجروح نظر آتی ہے اور اس تاثیر اور دل کشی کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے جو اس طرح کے موضوعات میں قاری کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے ___ ایک اقتباس دیکھیے۔ اس میں عقل اور نیکی سے ناآشنا لوگوں کی حقیقت بتائی گئی ہے:

"جو لوگ عقل اور نیکی سے ناآشنا ہیں اور سراسر زبان کے چٹخارے اور نفسانی شہوتوں کی تسکین میں مشغول، وہ بس درمیانی درجے تک ہی اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں اور ساری عمر اسی علاقے میں اِدھر اُدھر مٹر گشت کیا کرتے ہیں اور حقیقی عالم بالا میں بیچاروں کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ نہ خود یہ اُدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں نہ وہاں کی راہ کا انھیں پتہ چلتا ہے۔ نہ یہ حقیقی وجود سے پُر ہوتے ہیں اور نہ خالص اور دائمی مُسرّت سے ان کے کام و دہن لذّت یاب۔ ان کی مثال بس مویشیوں کے ایک گلّے کی سی ہے کہ آنکھیں نیچی کیے اور اپنا سر زمین کی طرف یعنی اپنے دسترخوان کی طرف جھکائے ہیں کہ کھا کھا کر پھول رہے ہیں اور اپنی نسل بڑھا رہے ہیں۔ پھر ان مسرتوں سے انتہائی عشق کے باعث اپنے آہنی سینگوں اور کھروں سے ایک دوسرے

کو ٹکریں اور لاتیں مارتے ہیں اور غیر تسکین پذیر خواہش کی خاطر ایک دوسرے کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک غیر حقیقی شے سے بھر لیتے ہیں۔ لہٰذا اُن کا وہ حصّہ بھی جسے یہ پُر کرتے ہیں غیر حقیقی، بے قابو اور بے لگام ہوجاتا ہے۔ (ریاست)

اس کی زبان تو سادہ ہے مگر الفاظ اور جملوں کا دروبست قاری کی دلچسپی کا سامان فراہم نہیں کرتا۔ وہ فطری تاثر اور بیان کی دلکشی بھی معلوم نہیں ہوتی جو ترجمے کو تخلیق بناتی ہے۔ شروع کرتے ہی ترجمے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ایک اور اقتباس دیکھیے جس میں منطق اور دوسرے علوم و فنون کی طاقت و صلاحیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اقتباس اور اوپر دیا گیا اقتباس پورے پورے مکالموں کے ہیں۔ مکالمے کا درمیانی یا آخری حصّہ نہیں۔ اقتباس دیکھیے:

"لیکن زنجیروں سے قیدیوں کی رہائی، خالی سایوں سے کام کا نکالنا اور پھر روشنی میں اصلی چیزوں کی طرف رخ موڑنا، زیر زمین غار سے آفتاب تک ان کا ابھرنا۔ پھر آفتاب کے حضور میں جانوروں اور درختوں اور آفتاب کی روشنی کی طرف دیکھنے سے معذوری البتہ اپنی ان کمزور آنکھوں تک سے پانی میں ان عکسوں کو دیکھ سکنے کی طاقت جو الٰہی ہیں اور حقیقی وجود کا سایہ ہیں (نہ کہ اس عکس کا سایہ جو آگ کی روشنی سے پڑتا ہے جو آفتاب کے مقابلے میں خود بمنزلہ عکس کے ہے) یہ روح کی اعلاترین اصل کو وجود کے بہترین حصّے کے تفکر تک ابھار سکنے کی قوت، جس کا مقابلہ ہم اس صلاحیت سے کر سکتے ہیں جو جسم کا نور ہے اور جو مادی اور مرئی دنیا کے روشن سے روشن حصّوں تک ہمیں پہنچا سکتی ہے۔ ہاں! تو یہ قوت جیسا کہ میں کہہ رہا تھا ان فنون کے مطالعے اور تحصیل سے ہاتھ آتی ہے جس کا ابھی ذکر تھا۔ (ریاست)

یہ ترجمہ یقیناً اصل کے مطابق ہوگا لیکن اس میں اصل ذاکر صاحب نظر نہیں آتے۔

حقائق کے بیان پر ذاکر صاحب کی قوتِ متخیلہ کی گرفت ڈھیلی معلوم ہوتی ہے جس کی مدد سے حقائق کو مرتب اور منظم کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ ترجموں میں یہ ترتیب و تنظیم ہی اسلوب میں دلکشی اور تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ ترجمے ذاکر صاحب کے اسلوب تک پہنچنے میں زیادہ معاونت نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا مقصد دوسروں کے خیالات سے اردو دنیا کو متعارف کرانے تک محدود رہا ہو اور ذاکر صاحب نے دوسروں کے خیالات کو اپنے افکار کی آنچ سے تپا کر پیش کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اس خیال کو 'ریاست'، کتاب کے مقدمہ سے تقویت ملتی ہے۔ اس کا مقدمہ ذاکر صاحب کے اسلوب کی انفرادیت اور تخلیقی ذہن کے دریچوں سے ان کی دانشورانہ شخصیت کو ظاہر کرنے میں زیادہ مددگار ہے۔ ذاکر صاحب نے افلاطون کا تعارف ایسے شگفتہ انداز اور دلکش اسلوب میں کرایا ہے کہ قاری پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ اس کا انداز بیان سلاست و روانی، تاثیر اور عرفان کی مسحور کن فضا ایسا جادو جگاتی ہے کہ افلاطون پر ذاکر صاحب کی شخصیت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "انسانی زندگی، ذہنی زندگی یعنی جماعتی زندگی ہے۔ ہماری زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ اجتماع میں یا کم سے کم دوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ حیاتِ انفرادی کا پودا جماعت کی نموبخش فضا میں پرورش پاتا ہے۔ من و تو دونوں یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں۔ بچّہ ہی ماں کو ماں بناتا اور اس میں وہ ساری ذہنی خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو عورت میں محض بہ حیثیت جنس نہیں ہوتیں اور ماں ہی اپنی محبت اور شیفتگی سے بچے کی ذہنی زندگی کو وہ متاعِ گراں مایہ دے سکتی ہے جس کا بدل دنیا کی کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اچھا استاد شاگرد سے اور اچھا شاگرد استاد سے، سچا گرو چیلے سے اور سچا چیلا گرو سے وہ منازلِ ذہنی و روحانی طے کرا دیتا ہے جو اس کے بغیر ناقابلِ تصوّر ہوتے ہیں۔ جس زندگی کے ساز کو کسی دوسری زندگی کا مضراب نہیں چھیڑتا، اس کے نغمے خاموش ہی رہتے ہیں۔ جس زندگی کی کلی کو دوسری زندگی کی حیات بخش شبنم نہیں نصیب ہوتی وہ شگفتہ ہو جانے کی جگہ مرجھا جاتی ہے۔ افلاطون کی

زندگی کی کلی اس وقت کھلی جب اس پر اس انوکھے بوڑھے سقراط کی نظرِ بہار اثر پڑی۔ (مقدمہ ریاست)

اس چھوٹے سے نثر پارے میں ذاکر صاحب کے اسلوب کی انفرادی شان الگ ہی ظاہر ہوتی ہے۔ یہی شان ان کی دوسری مستقل بالذات تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں فکر انگیز خیالات، فکری جمال اور شخصیت کے جلوۂ صد رنگ کی وہ آب و تاب ہے جو بقول آل احمد سرور الفاظ میں لپٹی ہوئی بجلیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں فنکارانہ شوخی، دل سوزی، گرمی اور تحلیل کی وہ چاشنی ہے جو ادبی شعور اور زبان پر مضبوط گرفت سے تیار ہوتی ہے، ایسی جذباتی کیفیت موجزن ہے جو پڑھنے والے کو مسحور کر دیتی ہے۔ سادہ زبان اور دل میں اتر جانے والی دل کش ترکیبیں اور الفاظ کی آتش نفسی ذاکر صاحب کے طرزِ نگارش پر انفرادیت کی مہر ثبت کرتے ہیں۔

ذاکر صاحب کی دیگر تصانیف میں 'معاشیات' 'مقصد اور منہاج' 'تعلیمی خطبات' اور بچوں کی کہانیوں کے مجموعے 'ابو خاں کی بکری' اور 'کچھوا اور خرگوش' ہیں۔ ذاکر صاحب کے فنی تار و پود اور ان سے بننے والی شخصیت کا جلوہ خطبات میں بھرپور نظر آتا ہے۔ ان کی نثر کے مخصوص اسلوب کی شناخت کے لیے خطبات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ خطبات ذاکر صاحب کے برسہا برس کے تجربات، تابانیِ فکر، اور علم و عرفان کا نچوڑ ہے۔ خطبات کے پیش لفظ میں مجیب صاحب نے لکھا ہے:

"ان تعلیمی خطبات میں وہ خامی نہیں ہے جو کتاب میں ہوتی ہے اور قدرتی استعداد نے زبان کو اپنا خادم بنا کر ان میں وہ خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو ادیبوں کی تحریر کو برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان خطبات میں انداز تقریر کا ہے، تحریر کا نہیں۔ ان میں کوشش کی گئی ہے کہ قلم اور کاغذ اور کتاب کو درمیان سے ہٹا کر آپ سے براہِ راست بات کہی جائے اور اس طرح کہی جائے کہ آپ کے دل کو لگے۔" (پیش لفظ تعلیمی خطبات)

مجیب صاحب کے یہ خیالات ذاکر صاحب سے عقیدت مندی سمجھے جا سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ خطبات کا انداز تقریر کا ہے تحریر کا نہیں لیکن ادب کے نقطۂ نظر سے تحریر کے اسلوب اور تقریر کے انداز میں فرق کا لحاظ رکھنا ہی ہوگا۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ خطبات کہنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ذاکر صاحب بنیادی طور پر معلم اور باعمل زندگی کے پیرو تھے۔ ادب کے گہرے شعور کے ساتھ ادب کے مقصد اور اس کی تعلیمی اہمیت پر ان کی ہمہ گیر نظر تھی۔ جو رنگا رنگی، دل کشی اور بوقلمونی ان کی شخصیت میں تھی، خطبات کے زبان و بیان سے اس کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔ اچھے اسلوب کی پہچان خیال کی صداقت، شخصیت کی انفرادیت، اظہار میں موزونیت اور الفاظ کی تزئین و آراستگی سے ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی سلیس اور عام فہم نثر کے بھی اوصاف ہیں جو ان کے اسلوب کی انفرادیت کا اعلان کرتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقعہ پر دیے گئے خطبہ کا ایک اقتباس دیکھیے جس سے بے ساختہ طرز بیان، مزاح کی چاشنی اور وضاحتی انداز کی دلکشی اور تخلیقی قوت کا کتنا دلچسپ اظہار ہوتا ہے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخلے کے وقت کی بازیافت کتنی خوبصورت اور جاندار ہے:

"مجھے یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے اپنے کچی بارک کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا۔ گھنٹی بجی، میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے کہ ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ اور جراب اور انگریزی جوتے پہنے بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۷ برس تک بہم پہنچا چکا تھا، یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی، اور دیر کیسے نہ کرتا، جوتے کا فیتہ ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا۔ اس میں سلیقے سے گرہ دینے کا جو فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرا دی تھی وہ گھبراہٹ میں سب ذہن سے اتر گیا اور کئی بار کے بست و کشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا۔ لیکن جب کس بندھ کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے

زیادہ جو کس ساتھی ڈائننگ ہال جا چکے تھے۔ یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد۔

راستہ معلوم نہ تھا۔ نہ جانے کتنی دیر اِدھر اُدھر گھومتا پھرا اور اپنے خیال میں تلاشِ منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے ہی کمرے کے سامنے آن پہنچا۔ کمرہ بند تھا۔ دوسرے کمرے بھی سب بند تھے۔ گھڑی دیکھی۔ یہ بھی اسی دن نئی نئی بھائی صاحب نے دی تھی۔ اس سے پہلے اسکول کے گھنٹے یا سورج کی مدد سے دن کی تقسیم کر لیا کرتا تھا۔ گھڑی جو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اُسے گزرے صرف آٹھ منٹ ہوئے ہیں اور اس جان ناتواں نے اس آٹھ منٹ میں خود فراموشی، بازیافت، تلاشِ منزل، گم کردہ راہی اور ناکامیِ سفر کے جملہ مقامات طے کر لیے تھے۔

سچ ہے، وقت صرف گھڑی کی سوئیوں ہی سے نہیں ناپا جاتا، جس پر یہ گزرتا ہے، اس کی کیفیت بھی اس کا ایک پیمانہ ہے۔ کبھی چند منٹ، انتظار اور مایوسی کے چند منٹ پہاڑ بن جاتے ہیں، کبھی کشف حقیقت قصدِ نیک، مشاہدۂ جمال، مجاہدانہ سرفروشی کے ایک لمحے میں ازل اور ابد سمٹ کر سما جاتے ہیں، کبھی بے مقصدی، بے راہ روی، بے دلی میں پوری پوری عمر بیت جاتی ہے کہ گھڑی کا ایک منٹ بھی اس پر حقارت سے ہنستا ہے۔"

(تعلیمی خطبات)

بات سے بات پیدا کرنے اور لفظوں سے مقصد برآری کا کام لینے کا کتنا دل کش انداز ہے۔ اس میں زندگی کی قوتِ نمو بھی ہے، ذہنی عظمت بھی۔ ظرافت کی ہلکی سی چاشنی بھی ہے اور نکتہ سنجی بھی۔ ادائیگی کا لطف بھی ہے اور معانی کا تجربہ بھی۔

عام طور پر اظہارِ بیان کی دو شانیں ہوتی ہیں۔ ایک نفس مطلب کا فطری اظہار بیان۔ دوسرے فکری انداز بیان۔ ذاکر صاحب کی تحریروں میں دونوں شانیں مل جاتی ہیں۔ ان کے اسلوب اور طرزِ نگارش کے جوہر افکار و تخیلات میں ڈھل کر جلا پاتے ہیں اور مقصد

کی روشنی میں نہا کر بنتے سنورتے ہیں۔ سادہ بیانی جذبات میں کھو کر روانی و دلکشی پا تی ہے۔ الفاظ خلوص کی آنچ سے گرمی پا کر ڈھلتے ہیں۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے جو ڈاکٹر صاحب کے سماجی شعور، بالغ نظری اور فکری بلندی کا ثبوت بھی ہے اور جس سے اندازِ بیان میں جذباتیت و خطابت سوز و گداز۔ تخیل کی روانی، زبان کے گہرے شعور اور استعاروں سے جذبے اور ضمیر کی آواز کی ترسیل میں مدد لینے کے گر کا اظہار ہوتا ہے:

"یہ اس دن کی یاد اس تفصیل سے کیوں آ رہی ہے آج؟ شاید اس لیے کہ وہاں سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے، مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا۔ گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق۔ یہاں بہت سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دل گیر ہونا سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے۔ بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا، اپنی قومی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا دیکھے، پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں؛ اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں اُبھرتا ہوا محسوس کیا۔ اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا؛ سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے شعلے کی طرح بھڑک بھی اٹھے، مگر سچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی ملا، صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو و نما دے سکنے کے لیے ان میں زندگی کی تند اور تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت، مگر غیرت کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی، خلوت و جلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا، یہاں فرماں برداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب،

چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب، سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ
خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب
اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت
بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی، باغی بنے، نکالے گئے، دوسری
بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی مگر اس مادرِ علمی کی طرف دل میں
کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی بن باس میں بھی دل اسی میں اٹکا رہا۔"
(اقتباس خطبہ علی گڑھ)

فکر و نظر کی بلندی، طبیعت کی معصومیت، مزاج کی سادگی، دل کی دردمندی و شگفتگی
کا اثر ذاکر صاحب کی نثر پر بہت گہرا ہے۔ اسلوب میں وضاحتی کیفیت، تحلیلی انداز، سنجیدہ و
متین لہجہ اور خطیبانہ جوش ان کی معلمانہ شخصیت کا آئینہ ہیں۔ ایک اقتباس پیش ہے:

"یاد رہے کہ ذہن کی غذا ذہن ہی ہے، یعنی تمدنِ انسانی کی وہ ان گنت
تخلیقیں جن میں ذہنِ انسانی اپنے کو رچا تا ہے، اپنی توانائی کے خزانوں کو
ان میں لا کر جمع کر دیتا ہے۔ یہ اپنی فکر کی کاوشوں کو، اپنی جمالیاتی نظر اور
مشاہدوں کو، اپنے اخلاقی منصوبوں کو، اپنے دل کے ارمانوں کو، اپنی پسند
کو، اپنی ناپسندیدگی کو، اپنے کشف حقائق کو، اپنی روح کی تسلیوں اور
بے تابیوں کو، ان میں متشکل کر دیتا ہے۔ یہ سب ذہنی تخلیقیں ذہنی توانائیوں
کا خزانہ ہوتی ہیں۔ ان ہی ذہنی توانائیوں سے دوسرے ذہنوں کی غذا کا
کام لیا جا سکتا ہے۔ پابندی بس اتنی ہے کہ جس ذہن کی تخلیق سے غذا کا
کام لینا ہے اس کی ساخت اور جس ذہن کو غذا پہنچانی ہے اس کی ساخت
میں مناسبت ہو۔ نہ ہر جسمانی غذا ہر جسم کے لیے ایک سی مناسب ہوتی ہے
نہ ہر ذہنی غذا ہر ذہن کے لیے۔ پہلی صورت میں مناسبت کی حدیں ذرا وسیع
ہیں، دوسری میں شاید اتنی وسیع نہیں۔

ذہنِ معروض اور ذہنِ موضوع میں مطابقت اور مناسبت کا خیال رکھنا

تعلیم کا بنیادی گُر ہے جیسے بہرے کے ذہن کی تربیت موسیقی سے نہیں کی جا سکتی جیسے اندھے کے ذہن کی نشو و نما کے لیے مصوّری سے کام نہیں لیا جا سکتا، اسی طرح جس ذہن کی ساخت ادبی اور تخلیقی ہو اس کو صنعت کے سرمایۂ تمدّن سے، جس کی ساخت نظری ہو اس کو عملی اشیا سے تربیت نہیں دی جا سکتی۔ اس میں ضد کرنا قدرت کے منشا کی نافرمانی کرنا ہے، ذہن کی تربیت کی راہ کو بند کرتا ہے، آدمیوں کو میاں مٹھو بنانے کی نامبارک کوشش ہے۔"

ذاکر صاحب کا خطیبانہ اندازِ بیان خیالات کی اہمیت، خلوص اور اعتماد کا ثمر ہے۔ اس اندازِ بیان میں خلوص کا سوز بھی ہے اور افکار کی سحر کاری و انفرادی دل آویزی بھی۔ ان کا طرزِ تحریر دل کے سوز و گداز سے اظہار کی قوت حاصل کرتا ہے۔ اچھے استاد کی خوبیاں دیکھیے،

"سچے استاد کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ دوسرے آدمیوں سے محبت رکھتا ہو، اس کے دل میں آدمیوں سے بحیثیت آدمی پیار ہو۔ آپ ان سچے معلّموں، اچھے استادوں پر نظر ڈالیے تو ان میں بہت سے گہرے مذہبی لوگ نظر آئیں گے، حسن و جمال کے دل دادہ آرٹسٹ بھی ان کی صف میں ملیں گے، لیکن یہ صفتیں ان کی ذہنی بناوٹ میں بیل بوٹے ہیں، تانا بانا وہی، خدمت کا شوق اور بنی نوع کی محبت ہے۔

اُستاد کی کتابِ زندگی کے سرورق پر "علم" نہیں لکھا ہوتا "محبت" کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہے، ان سے محبت ہوتی ہے، ان ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں۔ ان میں جہاں تک اور جس اسلوب سے ان خوبیوں کی تکمیل کا سامان ہے، یہ اس میں مدد دیتا ہے، اسی کام میں اپنے دل کے لیے راحت اور اپنی روح کے لیے تسکین پاتا ہے۔"

سادگی و پرکاری سے معمور یہ دلنشین اسلوب ذاکر صاحب کی نثر کا امتیازی وصف ہے۔

ذاکر صاحب معلم تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پر ان کی خاص نظر تھی۔ اس جذبے کے تحت ذاکر صاحب نے کہانیاں بھی لکھیں۔ یہ کہانیاں مختلف موضوعات پر ہیں۔ سادہ زبان اور دل کش اندازِ بیان میں ذاکر صاحب جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہانیوں کا مقصد بچوں میں انسانی اقدار کے ان اعلا جذبات کو ابھارنا ہے جن کے خمیر سے بہتر سماج کی تعمیر کی جا سکتی ہے چونکہ اسلوب کا رشتہ فن سے جڑا ہوا ہوتا ہے اس لیے کہانیوں کو فکشن کے تناظر میں دیکھنا صحیح ہوگا۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ طوالت کے خوف سے کہانیوں کے بارے میں اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ کہانیوں کا اندازِ بیان ذاکر صاحب کی معلمانہ بصیرت کی روشنی میں نہائی ہوئی سہل نگاری کا مظہر ہے۔ الفاظ کی طلسم کاری اور اظہارِ بیان میں تدریس کی ایک دل نشیں اور اثر آفریں زیریں لہر کا مختصر نمونہ دیکھیے۔ گھاس پھیلتے پھیلتے جب پہاڑوں کی طرف بڑھنے لگتی ہے تو پہاڑوں کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے لیکن:

> "پہاڑ پر چڑھنے میں دم پھول پھول جاتا تھا مگر اس نے جو ٹھان لی تھی وہ کر ہی گزری۔ چٹانوں کی بولی یہ خوب سمجھتی تھی۔ انھیں بُرا بھلا کہتے سنتی تو جی ہی جی میں کہہ لیتی، کیے جاؤ بک بک اور ہنسے جاؤ مجھ پر، مگر ہنستا اسی کا جو آخر میں ہنسے۔ میں نے جو جی میں ٹھانی ہے وہ میں خوب جانتی ہوں اور دیکھنا، اللہ نے چاہا تو ایک دن کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ یوں ہی چھوٹے چھوٹے قدموں سے بڑی بڑی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔" (عقاب)

یہ کہانیاں اردو میں بچوں کے ادب کے سرمائے میں قابلِ ذکر اضافہ ہیں۔

افسوس ہے کہ ذاکر صاحب کے مکاتیب کا کوئی مجموعہ میرے علم میں نہیں آسکا۔ عبداللطیف اعظمی کی "مشاہیر کے خطوط" اور پروفیسر عبدالقادر کی حنائے علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے چند خطوط شامل ہیں۔ یہ خالصتاً ذاتی نوعیت کے ہیں اور زیادہ تر انتہائی مختصر، اتنے مختصر کہ ان کے ذریعہ ذاکر صاحب جیسی بلند قامت شخصیت کو چھوا بھی نہیں جاسکتا۔ ان خطوط سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ مکتوب نگاری میں بھی ذاکر صاحب کی نثر خطیبانہ جوش، محبت کی نرمی اور خلوص کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دو خطوط

کے اقتباسات نثری انفرادیت کے ثبوت کے طور پر پیش ہیں:

(۱) علی گڑھ ۱۶ مئی ۱۹۵۵ء پروفیسر عبدالقادر
۷۰۲ سابق صدر سینٹ فلومینا ز کالج میسور

منڈی پور چلنے کا خیال بہت اچھا ہے وہیں پہلے یا جہاں کہیں آپ دونوں کی رائے ہو۔ من از طریق نہ گویم رفیق می جویم۔ کورگ کی آب وہوا کے صحت بخش نہ ہونے سے نہ گھبرائیے وہاں بس دو تین دن رہنے کا قصد ہے۔ اتنے جلد وہاں کی مرطوب آب وہوا ہمارا کیا بگاڑے گی ؟ ہم خاصے خشک لوگ ہیں۔

نندی ہل وغیرہ کا پروگرام اس مرتبہ نہ ہو سکے گا اس لیے کہ ہم دونوں نے آرام و سیاحت کا خاص آمیزہ اپنے لیے تجویز کیا ہے۔ ایک ہفتہ سے یہاں پنچ گنی میں آرام کر رہے ہیں، اس کے بعد ایک دو ہفتہ ادھر اُدھر گھومیں گے۔ یہ بھی آرام ہی ہے اس لیے کہ اس طرح دماغ کو تفکرات مزمنہ سے کچھ افاقہ حاصل ہوتا ہے! ممکن ہے ہمارا مجوزہ نسخہ درست نہ ہو لیکن اسے آزمائے بغیر اس نتیجہ پر نہیں پہنچنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ میسور میں ۱۹، ۲۰، ۲۱ کو قیام ہوگا۔ آپ اور سہیل صاحب مالکِ کل ہوں گے۔ آپ کی صحبت ہمارے لیے ساری انسانیت کی قائم مقامی کرے گی۔ دوسرے انسانوں سے بچائیے گا تو کرم ہوگا۔ نسخہ میں یہی درج ہے۔

مشاہیر کے خطوط

(۲) میں نے جو آپ سے کہا تھا کہ مجھے جامعہ کے اکابر میں شامل نہ کیجیے (جامعہ سے یہاں مراد رسالہ جامعہ ہے) تو وہ خالی تکلف اور خاکساری سے نہیں لکھا تھا، مجھے یقین ہے کہ نہ میں نے کوئی ایسا کام کیا ہے، نہ کچھ افکار کو کوئی ایسی شکل

دی ہے کہ میرا جی چاہے کہ وہ کہیں محفوظ ہو جائیں۔ زندگی کھیل کھیل میں گزر گئی۔ اور جسے لوگ زندگی کہتے ہیں اس کے شروع کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور اب کیا آئے گی، یا شاید آجائے تو دیکھا جائے گا۔ اس وقت تک تو سارا زمانہ بچپن کا غیر شعوری یا نیم شعوری سا زمانہ رہا ہے۔ اب اس سلسلے میں مجھے بھول جائیے۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ ان پر مشقت سے کیا حاصل ہوگا۔"

خطوط کے لہجے میں بے ساختہ گفتگو کی روانی، اظہارِ بیان کا لطف، تازگی اور انفرادیت کی شان پائی جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کے اسلوب اور طرزِ نگارش کے جوہر علمی بصیرت کی آب وتاب سے روشن ہوتے ہیں۔ گہرے خیالات، بلند افکار ان کی صد رنگ شخصیت کے ذہنی دریچوں سے نکل کر اسلوب اور اندازِ بیان میں ڈھل جاتے ہیں۔ سادگی و سلاست جذبے کی آنچ سے پگھل کر روانی پاتی ہے۔ ان کا طرزِ تحریر عشق و محبت کے سوز و گداز سے قوت حاصل کرتا ہے ان کی نثر مقصد اور وضاحتی کیفیت کے طلسم سے نشہ طاری کرتی ہے، شراب کا سا لطیف اور حیات بخش نشہ۔

+

ڈاکٹر کامل قریشی

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ایک سوانحی خاکہ

ذاکر صاحب کے آباواجداد آفریدی پٹھان تھے، پٹھانوں کی بستیاں یوں تو سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے دور (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء) کے دوران پٹیالی اور کمپل (ضلع ایٹہ اور فرخ آباد) میں آباد کردی تھیں جو رفتہ رفتہ مسلسل پھیلتی رہیں لیکن ۱۸ ویں صدی کے اوائل میں خیبر اور کوہاٹ کے بہادر اور جنگ جو پٹھان فرخ آباد کے علاقے میں آباد ہونا شروع ہوئے اس علاقے میں بنگش قبیلے کے ایک سورما نوجوان محمد احمد خاں نے اپنی شجاعت اور بہادری کے سبب زبردست نام پیدا کیا تھا اس نے فرخ سیر کو اس کی تخت نشینی کی جدوجہد میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ مدد کی تھی اور فرخ سیر کے برسر اقتدار آجانے کے بعد نواب کا خطاب پایا تھا خطاب، جاگیر اور منصب چار ہزاری پانے کے بعد اسی محمد خاں بنگش نے فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد اور اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج آباد کیا تھا اور اس طرح ان علاقوں میں خیبر اور کوہاٹ سے آفریدی پٹھان مسلسل آکر آباد ہوتے رہے اور زیادہ تر قائم گنج میں اپنے محلے بناتے رہے اس علاقے میں اکثریت کے ساتھ اُن پٹھانوں کی آبادی ہوئی جن کا کام میدانِ جنگ میں اپنے کارنامے دکھانا اور سورمائی کے کمالات پیش کرنا ہوتا تھا اور اپنی بہادری کے جوہر دکھا کر سپاہیانہ شجاعت کی دادوتحسین حاصل کرتے تھے انہی آفریدی پٹھانوں کے ورثا کے طور پر آج تک بھی قائم گنج میں وہ خاندان آباد ہیں جن کی رگوں میں پٹھان خون موجود ہے اور جو اپنی شجاعت، غیرت، محبت اور بات کے دھنی ہونے کے لیے مشہور رہیں۔ قائم گنج کے مردم خیز علاقے میں پتورہ نالی

گاؤں کے ایک محلے مول خیل سے ذاکر صاحب کے خاندان کا تعلق ہے یہیں اُن کا آبائی مکان ہے اور اسی علاقے میں ان کی کاشتکاری کی زمینیں بھی تھیں۔ قائم گنج کا پُرانا نام مؤرشید آباد تھا اور اسی کو پرانی ڈانگ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔

ذاکر صاحب کے مورثِ اعلا کا تعلق 'تور کاکا' کے قبیلے سے ہے جن کو اس کے آخون، یعنی مذہبی پیشوا یا اُستاد یا گرو ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے دو مشہور بھائی تھے حسن اور حسین، حسین مدہ آخون یعنی بڑے استاد کے طور پر مشہور تھے جو اس علاقے میں آنے سے پہلے بچّوں کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دیتے تھے یہاں بھی انھوں نے معلمی ہی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ ایک صوفی صافی اور پاکباز انسان تھے، پٹھان اُن سے روحانی طور پر اس حد تک متاثر تھے کہ بہت سوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔

آج بھی قائم گنج کے قدیم قبرستان نندو خاں میں اُن کا مزار مرجعِ خاص و عام ہے لوگ وہاں نذرِ عقیدت پیش کرنے آتے ہیں انہی مدہ آخون حسین سے ذاکر صاحب کے خاندان کا براہِ راست تعلق ہے اور انہی حسین کے نام کی رعایت سے ذاکر صاحب کے افرادِ خاندان کے ناموں کے ساتھ حسین لکھا جاتا ہے۔ مدہ آخون حسین کے بیٹے احمد حسین خاں تھے اور اُن کے بیٹے محمد حسین خاں، محمد حسین خاں کے صاحبزادے غلام حسین خاں عرف چمّن خاں تھے جو ذاکر صاحب کے دادا تھے جو نہایت درویش صفت تھے اور فقیروں کی صحبت میں رہتے تھے اور خصوصًا دو بزرگوں کرم علی شاہ اور بنس بہاری سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ غلام حسین خاں کے بارے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے ایک بار وہ اپنا مکان تعمیر کرا رہے تھے کہ کسی بات پر کسی مزدور کو جھڑک دیا، اُن کے پیر و مرشد کو پتہ چلا تو وہ غلام حسین پر بہت ناراض ہوئے اور ان سے کہا کہ حسین اگر اس نو تعمیر مکان میں تم اور تمہاری اولاد عیش و آرام سے رہنا چاہتی ہے تو مزدور کو جھڑکنے اور سخت و سست کہنے کے کفّارے کے طور پر متھرا میں سنت سادھوؤں کی سنگت میں رہ کر چھ دن گزارو اور جب تمہارے دل سے گناہ کی کثافت کا

کا احساس دور ہو اور ضمیر مطمئن ہو جائے تو پھر واپس آکر مکان مکمل کرانا، غلام حسین نے مرشد کے حکم کی تعمیل میں متھرا کا سفر کیا وہاں سادھو سنتوں کی صحبت میں رہے اور ایک اچھے خاصے عرصے کی تپسیا کے بعد جب اُن کے قلب کو سکون ملا تو واپس ہوئے اور مکان کی تعمیر مکمل کرائی۔

ان ہی غلام حسین خاں عرف جھمن خاں کے دو لڑکے عطا حسین خاں اور فدا حسین خاں تھے، عطا حسین خاں فوج میں رسالدار تھے اور اُن کے کوئی اولاد نہیں تھی چھوٹے بیٹے فدا حسین خاں کی پیدائش ۱۸۶۵ء میں ہوئی وہ بعمر بیس سال تجارت کے شوق میں حیدر آباد چلے گئے اور وہاں مراد آبادی برتنوں کا کاروبار شروع کر دیا لیکن حصولِ تعلیم کا شوق دل میں پھر پیدا ہوا تو پڑھنے لکھنے میں مصروف ہوئے اور قانون کا امتحان پاس کرکے اورنگ آباد میں وکالت شروع کر دی، ساتھ ہی "آئین دکن" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کر دیا، وکالت اور رسالہ دونوں خوب چلے اور ان کی شہرت دکن بھر میں ہو گئی تو حیدر آباد آ گئے اور بیگم بازار کے علاقے میں جہاں تجارت کا آغاز کیا تھا وہیں دفتر بنالیا اور پھر اسی جگہ زمین لے کر مکان بھی تعمیر کرالیا اس مکان میں وکالت کا دفتر، کتب خانہ، اخبار کا دفتر اور اپنی رہائش گاہ سب کچھ منتقل کر لیا، فدا حسین خاں کی شادی قائم گنج کے کلال خیل کے نبی داد خاں کی لڑکی نازنین بیگم سے ہوئی، نبی داد خاں شریف، نیک اور نہایت حلیم آدمی تھے ایسی ہی طبیعت اُن کی جیٹی نازنین بیگم نے پائی تھی وہ سیرت وصورت دونوں اعتبار سے سادہ مزاج، بردبار، پاکباز متواضع اور نیکی و شرافت کا نمونہ تھیں، فدا حسین اور نازنین بیگم کی یہ جوڑی طبیعتوں کے میلان اور عادات واطوار کے لحاظ سے آفتاب و ماہتاب کی طرح تھی ___ ان فرشتہ صفت میاں بیوی کے باہمی رشتۂ ازدواج کے نتیجہ میں فدا حسین کے گھر سات لڑکے ہوئے جن کی ترتیب یہ ہے مظفر حسین، عابد حسین، ذاکر حسین، زاہد حسین، یوسف حسین، جعفر حسین اور محمود حسین۔ بڑے بھائی مظفر حسین صرف تیس برس جیے جو شادی شدہ تھے اور اُن کی اولاد میں دو لڑکے امتیاز حسین اور مسعود حسین

اور ایک لڑکی فاطمہ بیگم ہوئے، امتیاز حسن خاں نے ۱۹۶۶ء میں انتقال کیا۔
مسعود حسین خاں علی گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر رہے اور ابھی بفضل خدا حیات ہیں، مظفر حسین خاں سے چھوٹے بھائی عابد حسین اور زاہد حسین کا انتقال بعارضۂ تپ دق علی گڑھ میں ہی دورانِ تعلیم ہو چکا تھا، جعفر حسین بھی صغر سنی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ یوسف حسین خاں عثمانیہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر رہے پھر کچھ عرصے کے لیے مرکزی حکومت کی تعلیمی اسکیم کے تحت شملے میں رہے پھر غالب انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی سکریٹری ہوئے۔ روحِ اقبال، اردو غزل، فرانسیسی ادب اور یادوں کی دنیا کے علاوہ انھوں نے کافی دوسری تصنیفات و تالیفات کیں، انتقال کر چکے ہیں اولادیں راشدہ، اجمل حسین ان کی یادگار ہیں سب میں چھوٹے بھائی محمود حسین خاں نے تاریخ میں جرمنی سے پی، ایچ ڈی کی ڈگری لی، تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے، سلطان ٹیپو کے فوجی نظام پر کام کیا، وہابی تحریک پر تحقیق کی۔ کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر اور وائس چانسلر رہے اور پھر پاکستان کے وزیر تعلیم بھی بنے انتقال کر چکے ہیں۔
ذاکر صاحب کے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین کی پیدائش قائم گنج میں ۱۸۹۳ء میں ہوئی ان کے علاوہ باقی سب بھائی حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی سلسلے کے حساب سے ذاکر صاحب کا نمبر تیسرا ہے جن کی ۸ رفروری ۱۸۹۷ء مطابق (۶ رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ بروز پیر) کو حیدر آباد میں ولادت ہوئی، ذاکر صاحب کے والد فدا حسین حیدر آباد میں سخت بیمار ہو جانے کی وجہ سے اپنے وطن قائم گنج لوٹ آئے جہاں ۱۹۰۷ء میں بعمر ۳۹ سال انھوں نے وفات پائی اور اس خاندان کی سرپرستی کی ذمّہ داری ان کے بڑے بھائی عطا حسین خاں کے سپرد ہوئی جنھوں نے اپنے انتقال ۱۹۱۰ء تک بحسن وخوبی ذمّہ داری کے فرائض انجام دیے اور پھر تمام بچّوں کی نگرانی اور دیکھ بھال ان کے خالو حسن الدین خاں نے کی۔
والد کے انتقال سے قبل حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں ذاکر صاحب کی

ابتدائی تعلیم گھر پر ہی شروع ہو گئی تھی اور اس طرح اونچے خاندان کے بچوں کی طرح ذاکر صاحب گھر پر رہ کر انگریز ٹیوٹر کے ذریعہ پڑھے، والد کے انتقال کے بعد جب قائم گنج آئے تو انھیں مولوی بشیر الدین کے قائم کردہ (۱۸۸۹ء) اٹاوے کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا، یہاں ذاکر صاحب کو اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین کی سرپرستی ملی۔ ذاکر صاحب پر سید الطاف حسین کی نیکی، شرافت، اعلیٰ سیرت و کردار اور خلوص و محبت کے نقوش اس قدر گہرے پڑے تھے کہ انھوں نے زندگی بھر ان کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنی ترقی کی راہیں روشن کیں اور سید صاحب کی یاد اپنے دل سے کبھی محو نہیں ہونے دی وہ زندگی کے آخری لمحے تک اپنے محسنوں کو جب یاد کرتے تو سید الطاف حسین کا نام سرفہرست ہوتا، اسی اسکول کے اُن کے دوسرے اُستاد سید شرف الدین یاسؔ بھی تھے جو دین و مذہب اور شعر و ادب اور اپنے کٹر نیشنلسٹ خیالات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ ذاکر صاحب کی زندگی پر اُن کے بھی اثرات پڑے اسی کی وجہ سے ذاکر صاحب میں علم و ادب، تحریر و تقریر اور بحث و مباحثہ کا شوق پیدا ہوا نیز قومی و ملی مسائل میں دلچسپی کا آغاز بھی اسی دور سے ہوا، علاوہ ازیں اس زمانے کی ترکی کے جنگی حالات نے مسلمانانِ ہند میں غیر معمولی قومی و اسلامی بیداری پیدا کر دی تھی ——— ذاکر صاحب ترکی کی امداد کے کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے کے لیے اسکول کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جوشیلی تقریریں کرتے، اُن کی توجہ ترکی کے مظلومین کی طرف مبذول کراتے اور نہایت سرگرم رہ کر ان میں اسلامی غیرت و حمیت پیدا کرنے کے لیے جد و جہد کرتے، اسکول کے لڑکوں کے علاوہ ذاکر صاحب کی اپیل پر اٹاوے کے مسلمان گوشت کھانا بند کر کے ترکی کے امدادی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیتے تھے اور ذاکر صاحب یہ چندہ ترکی فنڈ میں بھیج دیا کرتے تھے، ترکی کی جنگ کے واقعات سے جہاں اُن کو عالم اسلام کے واقعات سے واقفیت ہو رہی تھی وہاں وہ اخباروں بالخصوص پائنیر وغیرہ کے ذریعہ مختلف سیاسی و سماجی معلومات فراہم کر رہے تھے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں طاعون کی وبا پھیلی

جس میں گھر کے گھر ویران ہوئے اور یہ گھر بھی لپیٹ میں آگیا، دوسرے رشتہ داروں عزیزوں کے علاوہ ذاکر صاحب کی والدہ بھی اس وبا کی شکار ہو گئیں اور اُن کی دنیا تیرہ و تار ہو گئی، ذاکر صاحب کی والدہ نے اُن پر اپنی شخصیت کے نہایت گہرے نقوش چھوڑے تھے اسی دور میں ذاکر صاحب ایک صوفی بزرگ پیر حسن شاہ سے بھی بیعت ہو گئے تھے اور اُن کی صحبتوں سے فیض حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے حسن شاہ کو بھی مرید سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ ذاکر صاحب کی بیماری کے زمانے میں دوا اور دعا دونوں میں شریک رہتے تھے، صوفی حسن شاہ کا بھی ذاکر صاحب نے گہرا اثر قبول کیا تھا، اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول سے ذاکر صاحب فارغ ہوئے تو انھوں نے ۱۹۱۳ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ یہاں داخل ہونے سے قبل اُن کے دو بڑے بھائی عابد حسین اور زاہد حسین پہلے ہی سے طالب علم کے طور پر موجود تھے۔ ۱۹۱۵ء میں ذاکر صاحب کے بڑے بھائی نے قائم گنج میں ہی شاہجہاں بیگم سے اُن کی شادی کر دی تھی جن سے اُن کی تین لڑکیاں ہوئیں سعیدہ بیگم، صفیہ بیگم اور رقیہ ریحانہ۔ رقیہ ریحانہ پانچ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ سعیدہ بیگم کی شادی جناب خورشید عالم خاں سے ہوئی اور صفیہ بیگم ظل الرحمٰن خاں شاہجہانپوری سے بیاہی گئیں۔

علی گڑھ کا داخلہ ذاکر صاحب کے لیے ایک نئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ انھوں نے قوم و ملت کے اس بڑے تعلیمی ادارے میں آکر دنیا کو ایک نئے انداز سے دیکھا، وہ ساتھیوں سے ملے اُن میں رہے نئی چیزوں اور نئے مسائل سے واقف ہوئے اور اپنی معلومات میں اضافے کرتے رہے۔ انھوں نے اسے ایم یو علی گڑھ سے ایف اے کا امتحان سائنس سے پاس کیا اور پھر لکھنؤ اس لیے چلے گئے کہ وہاں میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر ڈاکٹری کا امتحان پاس کریں لیکن قسمت نے یاوری نہیں کی وہ بیمار پڑ گئے اور جسمانی و ذہنی الجھنوں کا شکار ہو کر قائم گنج واپس ہوئے لیکن جب صحت یاب ہوئے اور انھیں اپنی زندگی کی آس بندھی تو پھر ایک سال بعد دوبارہ

علی گڑھ میں داخلہ لیا اور اس بار سائنس کے مضامین کے بجائے آرٹس کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اقتصادیات کے ایم۔ اے کے ساتھ قانون کے کورس میں بھی داخلہ لے لیا۔ بی۔ اے میں اُن کے پاس انگریزی ادب، فلسفہ اور اقتصادیات کے مضامین تھے اس لیے ایم۔ اے میں اقتصادیات ہی لینا پسند کیا اور قانون سے اُنھیں گہرا شغف تھا اس لیے قانون کا مطالعہ یوں ضروری تھا۔

ذاکر صاحب نہایت ذہین، ہوش مند اور سمجھ دار طالب علم تھے وہ کتابوں اور کلاسوں سے اس زمانے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن لائبریری، ریڈنگ روم اور خاص کتابوں کے علاوہ معلوماتِ عامہ سے اُنھیں گہری دلچسپی تھی اور ان کی یادداشت اس قدر بلا کی تھی کہ جو ایک بار پڑھ لیا وہ ذہن نشین ہوگیا وہ امتحان کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے تھے اور نہ ذہن پر کتابوں اور نوٹس وغیرہ کو بار بناتے تھے مگر جب لگ کر یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کے لیے بیٹھ جاتے تھے تو پھر اُن سے بڑا پڑھنے والا اور کامیاب ہونے والا کوئی اور نہیں ہوتا۔ رشید احمد صدیقی اُن کی ان تمام سرگرمیوں اور معمولات کے راز دار ہیں اُنھوں نے "ہمارے ذاکر صاحب" کے صفحات میں ایسے نہ جانے کتنے ہی پردے اُٹھائے ہیں اُن کا بیان ہے:

"جو بات ذاکر صاحب کو ممتاز کرتی وہ یہ تھی کہ یہ کورس کی کتابیں نہ خریدتے نہ پڑھتے تھے، زیادہ تر وقت اِدھر اُدھر گھومنے یا جہاں تہاں بیٹھ کر خوش گپیوں میں گزار دیا کرتے تھے لیکن اس میں لٹن لائبریری اور یونین کے دارالمطالعے کا روزانہ گشت ضرور شامل ہوتا، رات کو واپس آتے یا دن میں کہیں ملاقات ہوجاتی تو معلوم ہوتا کہ ہندوستان یا اس سے باہر کا کوئی علمی یا سیاسی مسئلہ اور کالج کا کوئی حادثہ پرائیوٹ یا پبلک یا ادبیات کا اشتہار ایسا نہ تھا جس کی اُن کو خبر نہ ہو"[1]

---

[1] آشفتہ بیانی میری

ذاکر صاحب کو علی گڑھ کے ماحول میں تحریر، تقریر، بحث و مباحثہ، سیاسی و سماجی معاملات کو سمجھنے اور زندگی کے نشیب و فراز سے فاتحانہ انداز کے ساتھ گزرنے کی تربیت حاصل ہوئی۔ یہیں اُن کو ایسے دوست ملے جن کی یادیں ہمیشہ اُن کی زندگی کا حصّہ بنی رہیں۔ یہیں یونین کے ماحول کے تحت وہ ایسے جادو بیان مقرر بنے جس کا کوئی منتر خالی نہیں جاتا تھا، وہ اپنی بات کو اپنے نقطۂ نظر کو اور اپنے خیال کو منوانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے اور انھیں اپنے اندازِ بیان سے مخالفت سے مخالف ماحول کو اپنا کرلینے کا سلیقہ آتا تھا، اُن کے ایسے معرکوں کا ذکر اُن کے ہمجولیوں اور ہمدموں نے بعض جگہ کیا ہے جس سے اُن کی ذہانت، موقعہ شناسی، حاضر جوابی اور ذکاوت کے کمالوں پر گہری روشنی پڑتی ہے، علی گڑھ کے اسی طالب علمانہ دور کی اُن کی وہ خدمات بھی یادگار اور روشن ہیں جو انھوں نے طلبار کی ترقی، یونیورسٹی کی تعمیر و اصلاح، استادوں اور شاگردوں کے درمیان محبت اور ادب و احترام کے گہرے رشتوں کی کوشش، ڈیوٹی سوسائٹی کے لیے جدّ و جہد، یونین کی کارکردگی میں غیر معمولی دلچسپی، اور طلبار کے لیے یونیورسٹی سے بہت سی سہولیات و آسانیاں فراہم کرنے کے تحت انجام دیں، وہ تعلیمی مصروفیات کے علاوہ اپنے احباب کے ساتھ ادبی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے ماہانہ رسالے علی گڑھ منتھلی میں "ڈپ" کے فرضی نام سے مضامین لکھتے تھے، مباحثوں میں پیش پیش رہتے تھے، تقریر کے فن میں اُن کا لوہا سب مانتے تھے اور اسی زمانۂ طالب علمی میں اُنھوں نے افلاطون کی کتاب PLATO REPUBLIC کا اردو ترجمہ "ریاست" کے نام سے اتنی شاندار، سلیس اور دل کش اردو میں کیا تھا کہ اُن کے اُس دور کے ساتھی اور اردو ادب کی مشہور و معروف ہستی مولانا اقبال سہیل نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا کہ،

"افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔"[1]

---

[1] ذاکر صاحب ص ۳۶

اردو کے ساتھ اُن کی انگریزی کا بھی جواب نہ تھا وہ اپنی تحریر و تقریر میں اردو انگریزی دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے اُن کے بارے میں مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ریمز باتھم نے کہا تھا کہ

"ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر و تقریر کا بالخصوص ان کی حاضر جوابی کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ کے بشتر اراکین سے کیا جا سکتا ہے"[1]

ذاکر صاحب جب ایم۔اے (اقتصادیات) کے آخری سال میں آئے تو اُن کا تقرر اکنامکس کے جونیر لکچرر یا اسٹوڈنٹ لکچرر کے طور پر ہو گیا تھا، اس دور میں خلافت کی تحریک شروع ہو گئی اور اسی کے ساتھ تحریک ترکِ موالات کی تیز تر سرگرمیوں کا بھی آغاز ہوا، یہیں سے وطن کی جنگِ آزادی اور انقلاب ملک نے ایک نیا ہنگامہ خیز موڑ لیا۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے زور سے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک طوفان کھڑا ہو گیا اور ہندوستانیوں میں اتحاد و اتفاق کی اس قدر گہری لہر پیدا ہوئی کہ ایسی مثال تاریخ جنگِ آزادی میں پہلے نہیں ملی تھی۔ ہندوستان بھر کے مختلف طبقوں کے علاوہ تعلیمی ادارے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ علی گڑھ کالج جو برطانوی حکومت کے حلیفوں کا مرکز کہا جاتا تھا، یہاں بھی طلباء میں دو گروپ بن گئے اور ایک انقلابی گروپ کی طرف سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ علی گڑھ برطانوی حکومت کی امداد لینا بند کر دے اور تمام امدادی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے، ان طلباء کو یہ توجہ دلانے والے قائد حکیم اجمل خاں اور علی برادران تھے، جب علی گڑھ کالج کے کارپردازوں پر کوئی بات کارگر نہیں ہوئی تو قائدینِ ملت نے براہِ راست رجوع کرنے کے لیے پیش رفت کی اور تحریک خلافت کے حامی طلباء نے یونین سے خطاب کرنے کے لیے مہاتما گاندھی، علی برادران، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کو دعوت دی جنھوں نے ۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۰ء

---

[1] آشفتہ بیانی

کو طلبا کے سامنے اپنا نقطۂ نظر واضح صورت میں رکھ کر اپنا موقف منوا لیا اور انجام کار ذاکر صاحب اور ان کے کچھ انقلابی ساتھیوں نے علی گڑھ کالج کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ ہی میں رکھی جس میں علی برادران، حکیم اجمل خاں، عبدالمجید خواجہ اور ذاکر صاحب پیش پیش تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا اس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی مقرر کیے گئے اور ذاکر صاحب ان کے مددگار کے طور پر شریک رہے تقریباً دو برس تک وہ جامعہ ملیہ کے اساتذہ وطلبا کے ساتھ گھل مل کر کام کرتے رہے اور پھر ۱۹۲۲ء میں معاشیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے (برلن جرمنی) روانہ ہوگئے برلن میں انھیں پروفیسر رومبارٹ اور اسپرینگر کی سرپرستی نصیب ہوئی، اپنے قیام کے دوران وہ جرمنی کے ہندوستانیوں کی انجمن کے صدر مقرر ہوئے یہیں ان کی ملاقات مسٹر چٹو پادھیا برادر اور مسز سروجنی نائیڈو سے ہوئی اور یہیں ان کے دن رات کے ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر مجیب تھے جن کا بعد میں زندگی بھر ساتھ رہا۔ برلن میں انھوں نے جرمن زبان پر قدرت حاصل کی، ایک کتاب مہاتما گاندھی کے پیغام اور مقصد حیات سے متعلق انھوں نے لکھی اور چھاپی اور اپنی تقریروں، تحریروں اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ مہاتما گاندھی اور ان کے مشن سے متعلق لوگوں کو واقفیت بہم پہنچائی ان مصروفیات کے علاوہ انھوں نے برلن ہی میں دیوان غالب اور دیوان حکیم اجمل خاں شیدا بھی چھپوائے، برلن میں ذاکر صاحب نے تقریباً تین سال کا عرصہ گزارا اور معاشیات میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے علاوہ بے پناہ مشاہدہ، گہرا تجربہ اور مغربی دنیا کے حالات کا مطالعہ وجائزہ لے کر وطن لوٹنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ ادھر ملک میں حالات تیزی سے بدلے اور تحریکِ خلافت سرد پڑنے سے جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی بددلی کا شکار ہونے لگی ایسے حالات میں اراکین جامعہ اسے بند کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ ذاکر صاحب نے جرمنی سے تار دیا کہ جامعہ کو بند نہ کیا جائے وہ اور ان کے ساتھی جامعہ کے لیے خود کو وقف کرنے کی قسم کھا چکے ہیں اس یقین دہانی اور مہاتما گاندھی کی ہمت افزائی پر

جامعہ کو بند کرنے کا ارادہ ترک ہوا، اور ذاکر صاحب جب ہندوستان واپس آئے تو علی گڑھ سے اسے گاندھی جی کی رائے کے مطابق قرولباغ دہلی منتقل کر دیا گیا اور ذاکر صاحب شیخ الجامعہ بنائے گئے اور اس کے تنِ بے جان کو نئی زندگی ملی۔ ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور دوسرے اساتذہ نے قومی جوش اور ملی فرض کے پیشِ نظر نہایت قلیل تنخواہوں پر جامعہ کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا، ذاکر صاحب، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور جامعہ کے دوسرے ساتھیوں نے اسے اٹھانے کے لیے تن من کی بازی لگا دی۔ اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی جدوجہد کی اور ملک کے مختلف حصّوں سے مالی امداد اور چندہ وغیرہ جمع کر کے جامعہ کو چلایا جاتا رہا اس کی مستقل مدد کے لیے اجمل جامعہ فنڈ قائم ہوا، اور انجمن تعلیم ملّی کا قیام عمل میں لایا گیا اور ملک کے دورے کیے گئے، اسے چلانے کے لیے ڈاکٹر انصاری، ذاکر صاحب اور جمنالال بجاج پیش پیش رہے۔

جامعہ کے اس قومی و ملّی اور تعلیمی کام میں ذاکر صاحب کا سابقہ ملک و قوم کے عظیم رہنماؤں سے ہو رہا تھا، خاص طور پر وہ حکیم اجمل خاں اور مہاتما گاندھی کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے اُن کی زندگی پر اپنی سادگی، تپ، تیاگ اور قربانی کے اعلا اوصاف کی وجہ سے حکیم اجمل خاں صاحب نے بڑے گہرے نقوش چھوڑے تھے وہ اُن کی ملّت کے لیے تعلیم کی کوشش، عوام میں بیداری کی جدوجہد اور ہندوستانیوں کی تعمیر و ترقی کے لیے دوڑ دھوپ سے بہت متاثر تھے، اسی طرح وہ مہاتما گاندھی کی ذات کو ملک و قوم کے لیے ایک ایسی مشعلِ راہ سمجھتے تھے جس کی روشنی ملک کے لیے بے انتہا ضروری تھی اُنھوں نے کہا تھا کہ:

"میں نے اپنی عوامی زندگی کا آغاز گاندھی جی کے قدموں میں کیا تھا اور وہی میرے پیرو مرشد تھے"[1]

[1] ذاکر حسین ص ۵

انھوں نے گاندھی جی کی تعلیمات اور اپنے آدرشوں کے پیشِ نظر ایک بار یہ بھی کہا تھا:

"انفرادی اور سماجی طور پر سادہ و پاک زندگی بسر کرنا، پسماندہ اور کمزور افراد کے ساتھ حقیقی اور پر خلوص ہمدردی کا اظہار کرنا اور ہندوستان کے مختلف طبقوں میں اتحاد و وحدت پیدا کرنا۔[1]

یہ سب کچھ انھوں نے زندگی میں اپنے آدرش بنا کر قدم قدم پر برتا اور عمل میں لائے۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ حکیم اجمل خاں کے لیے بھی ایک بار یوں اظہار کیا تھا:

"گاندھی جی کی حق بینی، حق شناسی، حق کوشی اور ہمہ گیر انسانیت کی آنچ نے اگر کچے سونے کو کندن بنا دیا تو حکیم اجمل خاں کے خلق و مروّت صبر و حلم نے اس پر جلا کر دی"[2]

ذاکر صاحب نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ جامعہ کی ترقی کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک ادارے کو زندگی دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے اور اس میں اپنے وقت، انرجی، صحت اور پوری زندگی کو اس طرح کھپا یا کہ وہ صرف جامعہ کے ہو کر رہ گئے اور شب و روز کی جدّ و جہد سے جامعہ کو معراجِ کمال پر پہنچانے میں ہر قسم کے جتن کیے، اُن کی کوشش سے حیدر آباد دکن کے دورے سے مالی امداد میں بہت کامیابی ہوئی اور جامعہ کے لیے اوکھلے کی زمین خریدی گئی۔ جہاں یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو جامعہ کی نئی عمارتوں کا سنگِ بنیاد ایک چھوٹے بچّے کے ہاتھوں رکھا گیا۔

مہاتما گاندھی کے ایما سے ذاکر صاحب نے ہندوستان کے تعلیمی نظام میں ایک نیا انقلاب لانے کے لیے واردھا اسکیم تیار کی چونکہ اِس سلسلے میں ۲۱، ۲۲، اکتوبر ۱۹۳۷ء کو مہاتما گاندھی کی صدارت میں بمقام واردھا اسکیم کانفرنس منعقد

---

[1] ذاکر حسین ص ۵ [2] نقوش، شخصیات نمبر

کی گئی اسی لیے اس نئی تعلیمی اسکیم کا نام واردھا اسکیم پڑا، اس کے صدر ذاکر صاحب مقرر ہوئے اور دیگر ممبران کے طور پر اس میں ملک کے مشہور ماہرین تعلیم کو شامل کیا گیا۔ یہ اسکیم جب عوام کے سامنے آئی تو اس پر نکتہ چینی اور اعتراض شروع ہو گئے جس کے مختلف جلسوں، اجلاسوں اور کانفرنسوں میں جواب دیے گئے جس کی تفصیل کے لیے وقت درکار ہے چنانچہ اس سے قطع نظر اتنا کافی ہے کہ واردھا اسکیم کے علاوہ ذاکر صاحب کے زیر قیادت ہی ہندوستانی تعلیمی سنگھ کا بھی قیام عمل میں آیا اور اس طرح ملک و قوم نئے تعلیمی ڈھانچے کے تجربے سے گذرے، لیکن جامعہ نے واردھا اسکیم کے تجربے پر اپنے تربیتی مرکز کھولے۔ اپنی مختلف منزلوں سے گذرتی ہوئی جامعہ، ذاکر صاحب کے ان الفاظ کی مکمل تصویر بنی جسے ذاکر صاحب نے مقصد سے تعبیر کیا ہے؛

"ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے اس کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے"[1]

بڑھتی ہوئی ترقی کے ساتھ ساتھ جامعہ میں عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا، علمی و ادبی دلچسپیوں کو فروغ ہوا، ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی سرگرمیاں تیز ہوئیں اس دوران جنگ عظیم ثانی شروع ہوئی اور اِدھر جنگِ آزادی کی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہونے لگی اور ساتھ ہی ملک میں فرقہ واریت کا زہر اور علیحدگی کے رجحانات بھی فروغ پانے لگے۔ ادھر جامعہ ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہو گیا تھا اور اس کی جوبلی کا جشن منانے کے لیے نومبر ۱۹۴۶ء کا وقت طے کیا جا چکا تھا جس کے لیے ملک کے بیشتر مقامات سے مالی امداد اور چندے کی کوششیں ہو رہی تھیں چنانچہ ۵ار نومبر ۱۹۴۶ء کو جامعہ کی جوبلی تقریبات کا آغاز ہوا، اور اس کے خاص دن ۱۷ار نومبر ۱۹۴۶ء کو کانگریس اور لیگ کے سربرآوردہ قائدین ایک ہی ڈائس پر موجود تھے اور یہ صرف ذاکر صاحب کے

[1] رسالہ جامعہ دسمبر ۱۹۳۶ء

اتحاد پسند مزاج، صلح کل طبیعت اور جمہوری اندازِ نظر کے سبب ہی تھا۔ ۱۹۴۶ء میں ہی عارضی حکومت کے قیام کے وقت ذاکر صاحب کو وزارت میں دعوت دی گئی تو انھوں نے انکار کر دیا اور جب عارضی حکومت کا تجربہ ناکام ہوا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا تو جامعہ میں آزادی کی تقریبات قومی وقار کے ساتھ منائی گئیں انھیں دنوں ذاکر صاحب شدید علالت کے سبب اپنے ڈاکٹروں کے مشورے سے کشمیر روانہ ہوئے تو جالندھر کے اسٹیشن پر فسادیوں نے انھیں ٹرین سے اتار کر زد و کوب کیا اور بندوق کی نال ان کے سینے پر رکھ دی، کچھ لوگوں کے پہچان لینے کی وجہ سے جان تو بچ گئی لیکن سامان سب لٹ گیا جب وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر دہلی آئے تو شہر فسادات کے شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا اور مسلمانوں کا کشت و خون کیا جارہا تھا ان حالات میں جامعہ اور اہلِ جامعہ کو بھی شدید خطرے تھے، ذاکر صاحب نے ایسے عالم میں مظلومین کی مردانہ وار خدمت کی جو ۱۹۴۷ء کے ہولناک دنوں کی تاریخ میں یادگار ہے۔

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی وجہ سے جس تباہی و بربادی سے ملک و قوم کو گزرنا پڑا وہ تو اپنی جگہ۔ لیکن اس سے سب سے شدید ضرب ہندوستان کے قومی تعلیمی اد[illegible] وں پر پڑی اور اس کا سب سے بڑا نشانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بننے کا خطرہ پیدا ہو گیا اس کو طرح طرح سے مطعون کیا جانے لگا اور اس پر بُری نظریں پڑنے لگیں اور خدشہ اس بات کا تھا کہ کہیں یہ ادارہ حالات کا شکار نہ ہو جائے اور کہیں اس کے سربراہ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اس سے ہاتھ نہ اٹھا لیں چنانچہ ایسے عالم میں پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما سے اس آڑے وقت میں ذاکر صاحب یونیورسٹی کی دستگیری کے لیے آگے بڑھے اور ۱۹۴۸ء میں بحیثیت وائس چانسلر علی گڑھ پہنچ کر اہم ذمہ داری سنبھالی۔

ذاکر صاحب کا علی گڑھ کا دور (۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۶ء) اپنی جگہ تعمیری اعتبار سے بڑا تابناک اور تاریخی ہے اس کی تفصیلات کے لیے دفتر درکار ہے لیکن اختصار کے ساتھ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ذاکر صاحب کے علی گڑھ آجانے کے بعد وہ خطرے ٹل گئے تھے جو

سے علی گڑھ دوچار تھا وہ شبہات اور شکوک دور ہونے لگے تھے جنھوں نے علی گڑھ کو گھیر لیا تھا سبھی فضاؤں میں زندگی نظر آنے لگی تھی اور کارواں پھر چل پڑا تھا۔ اس بُرے وقت میں ذاکر صاحب کی شخصیت ہر اعتبار سے ایک بہت بڑا سہارا بنی اور علی گڑھ کو وہ سب کچھ ملنے لگا جس سے اس کے محروم ہوجانے کا خوف تھا۔ ذاکر صاحب کے دم سے وہ غلط فہمیاں دور ہوئیں جو علی گڑھ، علی گڑھ قوم اور علی گڑھ یونیورسٹی سے متعلق علی گڑھ کے بدخواہوں میں موجود تھیں ذاکر صاحب کا دور وائس چانسلری ایک اعتبار سے یونیورسٹی کے لیے نئی زندگی کا دَور ہے، تعمیری دور ہے اصلاحی دور ہے اور قوم کے کارواں کو مسلسل آگے بڑھاتے رہنے کا دَور ہے اس کا اگر صحیح اندازہ لگانا مقصود ہے تو اس دور کی تاریخ کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے سے ہر شے واضح اور روشن نظر آسکتی ہے، اپنی وائس چانسلری کے دور میں ہی وہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر تھے اور انھوں نے اپنی رہنمائی میں اردو والوں کے پچاس ساٹھ لاکھ دستخط اس دور کے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کو پیش کیے تھے۔

۱۹۵۶ء میں کچھ ناموافق حالات کے تحت اور اپنی دوسری ٹرم ختم کرنے سے کچھ قبل ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوش ہونا چاہا تو انھیں اپنی ٹرم تک رہنے کے لیے کہا گیا لیکن وہ مصر رہے اور خرابیِ صحت اور علالت کی وجہ کا اظہار کرکے سبکدوش ہوئے اور پھر کچھ دنوں آرام کے بعد مولانا آزاد کی خواہش پر یونسکو کانفرنس میں شریک ہوئے وہاں سے پیرس اور پھر جرمنی چلے گئے، اسی دوران اپنے علاج کی طرف بھی متوجہ ہوئے ابھی وہ جرمنی سے سوئٹزرلینڈ ہی پہنچے تھے کہ انھیں پنڈت نہرو کا پیغام ملا کہ جلد وطن لوٹو اور بہار کی گورنری سنبھالو چنانچہ ہندوستان لوٹ کر انھوں نے گورنر بہار کی حیثیت سے جولائی ۱۹۵۷ء میں چارج لیا اور پانچ سال اس عہدے پر متمکن رہ کر بہار کی کایا پلٹ دی ایسے سرکاری غیر سرکاری، علمی ادبی، سماجی، تعلیمی اور ثقافتی کام انجام دیے جو بہار کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے وہ جب تک بہار میں ایک منتظم اعلا کے طور پر رہے وہاں کی حکومت کو استحکام حاصل

رہا، اصلاحات کا کام برابر جاری رہا، بہار کے تمام طبقے اُن کی کارکردگی، حُسنِ انتظام اور کارناموں سے اس قدر خوش تھے کہ آج تک سنہ ۱۹۵۷ء تا سنہ ۱۹۶۲ء کا زمانہ یاد کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۶۲ء میں ذاکر صاحب کی گورنری ختم ہوئی اور ادھر سنہ ۱۹۶۲ء میں جنرل الکشن کے نتیجے میں کانگریس کو ایک بار پھر غالب اکثریت حاصل ہوئی اور اس دوران اُن کی صحت بھی بہت بہتر ہو چکی تھی تو پنڈت نہرو کی تحریک پر کانگریس نے جہاں ڈاکٹر رادھاکرشنن کو صدارت کے لیے نامزد کیا وہاں ذاکر صاحب کا نام نائب صدر جمہوریۂ ہند کے طور پر تجویز کیا۔ ۷ رمئی سنہ ۱۹۶۲ء کو ذاکر صاحب کا الکشن ہوا اور وہ نائب صدر جمہوریہ چن لیے گئے اور انھوں نے اپنے دورِ نائب صدارت میں راجیہ سبھا کی صدارت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے کر اسے بھی یادگار بنا دیا، علاوہ ازیں وہ فرائض جو نائب صدر کو انجام دینے ہوتے ہیں مثلاً تقریبات کا افتتاح، صدارتیں، اجرار کی رسمیں، عظیم بیرونی مہمانوں کا خیر مقدم، بیرونی ملکوں کے دورے، صدر کی غیر حاضری میں صدر کے فرائض کی انجام دہی، حکومت کی نمائندگی، کانفرنسوں میں شرکت کنووکیشنوں کے ایڈریس وغیرہ پڑھنا یہ سب کام بھی بڑی خوش اسلوبی اور بڑی دلچسپی کے ساتھ انجام دیے، افریقی اور عرب ممالک سے گہرے تعلقات قائم کرانے، معاہدے کرانے اور تمام سرکاری ذمہ داریوں کو نہایت اچھے انداز سے نبھانے میں ذاکر صاحب نے ایک تاریخی رول ادا کر کے ملک کے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

اُن کی غیر معمولی فرض شناسی، کارکردگی اور مقبولیت کی وجہ سے اب ملک و قوم کی نگاہیں اُن پر صدر جمہوریۂ ہند کی صدارت کا بوجھ ڈالنے کے لیے اٹھ رہی تھیں ہر چند کہ ملک کی سیاسی صورت حال کافی تبدیل ہو چکی تھی اور کانگریس کے اندر اور باہر زبردست انقلاب رونما ہو چکا تھا لیکن شریمتی اندرا گاندھی کی تحریک اور اُن کے سینیر کانگریسی ساتھیوں کی تائید پر ذاکر صاحب کو صدارت کے لیے نامزد کر دیا گیا تو اگر ایک طرف ملک میں خوشی و مسرّت کا اظہار کیا گیا تو دوسری طرف فرقہ پرستوں کی صفوں میں ماتم کی فضا چھا گئی اور فرقہ پرستی نت نئے روپ بدل کر ظاہر ہوئی پھر بھی جیت سیکولرازم

اور جمہوریت کی ہوئی۔ ذاکر صاحب ۹ رمئی ۱۹۶۷ء کو صدر جمہوریۂ ہند منتخب ہوئے اور ۱۳ رمئی ۱۹۶۷ء کو انھوں نے صدارتی ذمہ داریاں سنبھالیں اور جمہوری طاقتوں میں ملک و بیرون ملک اس پر زبردست خوشی کا اظہار کیا گیا، دنیا کی عظیم جمہوریت کا یہ عظیم عہدہ سنبھالنے کے بعد اُنھوں نے جو تقریر کی تھی وہ نہایت پُر اثر اور متاثر کن تھی جس کا لب لباب یہ ہے :

"سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور اس کے باشندے میرا کنبہ، عوام نے کچھ عرصے کے لیے مجھے اس کنبے کا سربراہ منتخب کیا ہے میں سچی لگن سے اس گھر کو مستحکم اور خوبصورت بنانے کی کوشش کروں گا تاکہ یہ گھر ان عظیم لوگوں کے شایان شان بن سکے جو انصاف، خوش حالی اور شائستگی کی بنیادوں پر زندگی سنوارنے میں لگے ہیں[۱]"۔

اُنھوں نے اپنے کردار و عمل سے یہ ثابت بھی کر دیا کہ سارا ہندوستان واقعی اُن کا گھر ہے اور اس کے باشندے اُن کا کنبہ اور وہ اس کنبے کے سچّے اور حقیقی سربراہ ہیں۔ یوں تو انھوں نے اپنی ہر ذمّہ داری کو نبھانے کے لیے ہمیشہ فرض شناسی کا خیال رکھا لیکن اس عہدۂ جلیلہ کی عظمت کو چار چاند لگانے کے لیے وہ ہمہ وقت سرگرم و مصروف رہے اور اپنی شخصیت و خدمت سے انھوں نے ملک و قوم کی بھلائی کے لیے جو یادگار کارنامے انجام دیے اور ہندوستان کی سیکولر و جمہوری اقدار کو مستحکم بنانے کے لیے جو سعیٔ و جد و جہد کی وہ ان کے دورِ صدارت کی ایک ایسی داستان ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی صدارت ہی کے دور میں انھوں نے غالب صدی کو تاریخی اور یادگار طور پر منانے کے سامان پیدا کر کے پوری دنیا میں غالب کا ڈنکا بجا دیا تھا، آخر وہ وقت آ پہنچا جو ہر ایک کے لیے مقرّر ہے۔ چند روز پہلے ہی وہ ملک کے دورے سے واپس ہوئے تھے، ڈاکٹروں نے انھیں ایک ہفتے آرام کا مشورہ

---

[۱] بحوالہ ذاکر حسین ص ۱۲

دیا تھا۔ اُمید تھی کہ وہ صحت یاب ہونے کے بعد اپنا کام شروع کر دیں گے۔ ۳ر مئی ۱۹۶۹ء
کو وہ حسبِ معمول صبح چھ بجے اُٹھے، انھوں نے وقتِ مقررہ پر ایک گلاس دودھ
پیا پھر کچھ کاغذات وغیرہ دیکھے اور پھر کسی ایسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گئے
جسے وہ گذشتہ رات دیر تک پڑھتے رہے تھے، تقریباً گیارہ بجے ڈاکٹر اُن کے معائنے
کو آئے اس کے کچھ دیر بعد وہ غسل خانے میں گئے اور جب خلافِ معمول اُنھیں زیادہ
وقت ہوا تو اُن کے خدمت گار اسحاق نے آواز دی، جواب نہ ملنے پر دروازہ کھٹکھٹایا،
بالکل خاموشی پر دوسری طرف سے دروازہ کھولا گیا تو انھیں فرش پر گرا ہوا پایا، ڈاکٹروں
نے پہنچ کر انھیں ہوش میں لانے کی پوری کوشش کی لیکن سب بے سود، آخر گیارہ
بج کر ۵۵ منٹ پر ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ ذاکر صاحب خدا کو پیارے ہو گئے۔ گویا
کہ آفتاب اپنی تابانیاں دکھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا۔ ذاکر صاحب
ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ اس خبر سے ملک ہی نہیں بیرونِ ملک بھی صفِ ماتم بچھ گئی تھی،
سارا ماحول غم واندوہ میں ڈوب گیا تھا، ہر دل سوگوار اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔ دو روز
تک راشٹرپتی بھون کے دربار ہال میں اُن کا جسدِ خاکی آخری دیدار کے لیے لا کر رکھ دیا
گیا تھا، لاکھوں انسانوں نے اُن پر اپنی عقیدت کے پھول چڑھائے۔ ہر مذہب وملت
کے پیشواؤں نے اُنھیں خراجِ تحسین ادا کیا، مقدس مذہبی کتابوں کی تلاوت اور
پاٹھ ہوئے اور سب نے اپنے عقیدے کے مطابق اُنھیں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے
ہوئے دلی احترام کا اظہار کیا۔

پورے قومی وسرکاری اعزاز کے ساتھ ۵ر مئی ۱۹۶۹ء کو اُن کا جنازہ توپ گاڑی
پر رکھ کر جامعہ لے جایا گیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جس کے لیے وہ زندگی بھر جدوجہد
میں لگے رہے، جس کی تعمیر وترقی کے خواب عمر بھر دیکھتے رہے، جس کے آدرشوں کو بنانے
میں انھوں نے اپنے فکر وعمل اور کردار کے ذریعہ جہادِ مسلسل کیا، جس کو اپنے خون سے
سینچا اور جس کی آبیاری کے لیے اپنے جسم وجان کھپا دیے، اُن کا جسدِ خاکی آج اسی
کی خاک کے سپرد کر دیا گیا اور ذاکر صاحب کی زندگی کا وہ سفر جو ۸ر فروری ۱۸۹۷ء

میں شروع ہوا تھا ۳ رمئی سنہ ۱۹۶۹ء کو پورے ۷۲ سال کی جدوجہد، ایثار، تپ، تیاگ، وطن پرستی، انسان دوستی اور آفاقیت سے بھری داستان بیان کرتا ہوا اپنی کامیابی کی بلندیوں پر ختم ہوا اور ہر طرف سے ایک ہی آواز آئی :

کارواں خوابوں کا تیرے روز و شب جاری رہے
تا ابد تیری لحد پر رحمتِ باری رہے

پروفیسر گوپی چند نارنگ

ذاکر صاحب کی نثر: اردو کے بنیادی اسلوب کی ایک مثال

ڈاکٹر ذاکر حسین کی تربیت اقتصادیات میں ہوئی تھی، لیکن اُن کا دل قومی کارکن کا اور ذہن ادیب کا تھا۔ ماہر تعلیم ہونا یا ادیب بننا ان کی زندگی کا کبھی مقصد نہیں رہا، لیکن جس طرح ان کی قومی لگن نے انھیں معلّم سے ماہر تعلیم بنادیا، اسی طرح ان کی تخلیقی صلاحیت اور شائستہ متانت نے ان کی ہر بات میں ادبیت کی شان پیدا کردی۔ ان کی قومی اور تعلیمی خدمات نے انھیں اردو میں زیادہ نہیں لکھنے دیا، لیکن جتنا کچھ بھی انھوں نے لکھا، اس کی مدد سے ان کے اسلوب کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

اردو کا بنیادی اسلوب کیا ہے؟ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں سر سیّد کے بعد حالی، عبدالحق اور ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی نثر پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ ان مصنّفین کے ہاں اردو کے لسانی جینیس (GENIUS) سے آگہی اور اس سے انصاف کی کوشش ملتی ہے۔ اردو ایک انتہائی متنوع اور متمول زبان ہے۔ اس کی بنیاد ہند آریائی ہے، لیکن اس میں سامی، ایرانی اور دراوڑی لسانی خاندانوں کے عناصر بھی بر سرِ کار نظر آتے ہیں۔ صوتیات اور لفظیات کی سطح پر لسانی اثرات کی کئی مختلف الاصل پرتیں ایک ساتھ

کام کرتی ہیں، اسی طرح جملوں کی ترتیب و تہذیب کے بھی اس میں کئی رنگ ملتے ہیں۔ اُردو کی اس رنگا رنگی اور تنوع کا مطالعہ اگر اس کی سات آٹھ صدیوں کی تاریخ کے پس منظر میں کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ شروع ہی سے اس میں اسالیب کے دو دھارے ایک دوسرے کے متوازی بہتے رہے ہیں، اور اردو کے لسانی جینیس کی تشکیل میں مدد دیتے رہے ہیں۔

اتنی بات واضح ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اردو ایک عجیب و غریب مفاہمے کا نام ہے۔ یہ مفاہمہ دو عظیم ایشیائی تہذیبوں اور دو اہم لسانی گروہوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس لحاظ سے اردو نام ہے ایک تہذیبی اور لسانی توازن کا جو ایک طرف ہند آریائی اور دوسری طرف سامی و ایرانی عناصر کے درمیان صورت پذیر ہوا۔ اگر اس توازن کو ایک طرح کی "قدر" تسلیم کیا جائے (جو یہ یقیناً ہے) تو ماننا پڑے گا کہ جس طرح کوئی اخلاقی قدر کسی شخصیت میں یا کوئی تہذیبی قدر کسی دور میں اپنی سو فیصد مکمل حالت میں نہیں ملتی، بلکہ کوئی شخصیت یا عہد اس کی تکمیل کی کوشش ہی میں اپنی کامیابی کی حد تک اس سے منسوب کیا جاتا ہے، اسی طرح اردو کے کسی ایک اسلوب کو بھی اردو کے لسانی توازن کی مکمل شکل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی قدر کی طرح اردو کا لسانی توازن بھی ایک "تصورِ محض" ہے، جس کا سو فی صد حصول ناممکن العمل ہے۔ البتہ جو اسلوب اس توازن کو پا لینے اور اس کے فطری ربط و تناسب اور خوش آہنگی سے انصاف کرنے میں جس حد تک کامیاب رہا ہے، اسی حد تک اسے اردو کے بنیادی اسلوب سے قریب تر قرار دیا جائے گا۔ اردو کی کئی صدیوں کی تاریخ شاہد ہے کہ اس توازن کو پانے اور اس سے انحراف کرنے کی کوششیں ہر دور میں جاری رہی ہیں، اور ان دونوں میں عمل اور ردِ عمل کا وہ سلسلہ بھی موجود رہا ہے جس سے زندہ زبانوں کے ارتقا میں مدد ملتی ہے۔ اردو میں لسانی امتزاج و توازن کی تلاش اور اس سے انحراف کی انھیں کوششوں کو اوپر ہم نے اردو اسالیب کے دو بنیادی دھاروں سے تعبیر کیا ہے جو ہر دور میں ایک دوسرے کے متوازی بہتے رہے ہیں۔ ادبی معنویت سے قطعِ نظر، محض لسانی مزاج کے اعتبار سے گویا لگ بھگ ہر زمانے میں جہاں ایک مرزا محمد رفیع سودا رہا ہے، وہاں ایک میر تقی میر بھی رہا ہے۔ اسی طرح ایک میر عطا خاں تحسین کے بعد ایک میر امّن، ایک ناسخ کے دور میں ایک آتش،

ایک شاہ نصیر کے بعد ایک ذوق، ایک رجب علی بیگ سرور کے زمانے میں ایک غالب، ایک محمد حسین آزاد کے ساتھ ایک حالی اور ایک ابوالکلام آزاد کے ساتھ ایک مولوی عبدالحق کی موجودگی اردو اسالیب کے انھیں دو رجحانات کی تصدیق کرتی ہے۔ ایک لسانی دھارا عربی فارسی عناصر کی طرف جھکنے اور ان کی مدد سے زبان میں پرشکوہ اور غیر عام فہم الفاظ و تراکیب کے استعمال کا ہے دوسرا ملکی اور غیر ملکی عناصر میں ایک خوشگوار توازن کو پانے کی جستجو کا اور زبان کے ٹھیٹھ ٹھاٹ کو نباہنے کا ہے۔ ظاہر ہے اگرچہ پہلے دھارے کو اردو کے لسانی جینیس سے ہٹا ہوا کہا جائے گا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ اس کے منافی بھی نہیں۔ اس لیے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس میں تارید اور تمہید یعنی لسانی ردّ و قبول کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ پہلے لسانی گروہ کے ادیب و شاعر اگرچہ فارسی زدگی، مشکل پسندی اور بوجھل ترکیبوں کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن جس حد تک ان کی تخلیقی صلاحیت کسی لسانی عنصر کو قبولِ عام کے درجے تک پہنچانے میں مدد کرتی ہے، اس حد تک زبان کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے۔ دوسرے لسانی گروہ کے لکھنے والے زیادہ تر ان عناصر کو لیتے ہیں جو زبان میں رچ بس چکے ہیں یا جنھیں چلن یا استعمالِ عام نے قبولیت کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ یہ لوگ لفظوں کی آرائش یا زبان کے ظاہری شکوہ پر توجہ صرف نہیں کرتے، اس کے بجائے زبان کی امتزاجی کیفیت پر نظر رکھتے ہیں اور اس کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس گروہ کے لکھنے والوں کے اسلوب کو اردو کے بنیادی اسلوب سے قریب تر سمجھا جائے گا۔

ذاکر صاحب کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ اس کا سلسلہ جدید دور میں سرسیّد، حالی اور مولوی عبدالحق سے ہوتا ہوا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بعض کارکنوں تک پہنچا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکنوں سے ہماری مراد ذاکر صاحب کے علاوہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین اور محمد مجیب سے ہے، بلکہ خواجہ غلام السیّدین کو بھی اسی صف میں شریک سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ جامعہ سے سیّدین صاحب کا وہ منصبی تعلق نہیں رہا جو دوسروں کا رہا ہے، لیکن خیالات اور خدمات کے اعتبار سے وہ بھی اسی گروہ کے ساتھ جگہ پائیں گے۔ ان چاروں نے انگریزی کے علاوہ اردو کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اگرچہ ایک کا خصوصی مضمون اقتصادیات، دوسرے کا فلسفہ، تیسرے کا

تاریخ اور چوتھے کا تعلیم رہا ہے، لیکن بنیادی طور پر چاروں معلم ہیں۔ چاروں نے تعلیم ہی کے ذریعے ملکی اور قومی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ چاروں نے اس سلسلے میں "نیشنلسٹ نظریہ" اپنایا۔ چاروں نے کچھ اپنی افتادِ ذہنی کی وجہ سے، کچھ قومی خدمت کی ضرورتوں کے پیشِ نظر، اور کچھ گاندھی جی کے خیالات کے نتیجے کے طور پر انتہائی دل نشیں پیرایۂ بیان اختیار کیا اور دل کی بات دل تک پہنچانے کے لیے نسبتاً عام فہم اور آسان اسلوب کو اپنایا۔ چاروں نے تخلیقی نثر کے نمونے بھی پیش کیے۔ (مجیب صاحب اور عابد صاحب نے ڈرامے اور انشائیے، سیدین صاحب نے شخصی خاکے اور ذاکر صاحب نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں) لیکن اصلاً چاروں نے اردو نثر کو علمی کاموں کے لیے استعمال کیا۔ چاروں کے انفرادی اسالیب کی ذیلی خصوصیات ان کے موضوع کی رعایت سے الگ الگ ہیں، لیکن چاروں کا اصل کارنامہ جس کی بدولت انھیں اردو نثر کی تاریخ میں الگ سے پہچانا جائے گا اور جس کی وجہ سے انھیں جدید اردو نثر کے "عناصر اربعہ" کہا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ اس دور میں انھوں نے اردو کی علمی نثر کے دامن کو وسیع کیا اور ایسے اسلوب کی مثالیں پیش کیں، جو اردو کے بنیادی اسلوب سے نہایت قریب ہے۔

۲

ترسیل کے نقطۂ نظر سے نثر نگار تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنھیں مخاطب یاد رہے یا نہ رہے، اپنی ذات ضرور یاد رہتی ہے، دوسرے وہ جنھیں اپنی ذات یاد رہے یا نہ رہے، مخاطب ضرور یاد رہتا ہے، اور تیسرے وہ جنھیں نہ اپنی ذات کا پتا ہوتا ہے نہ مخاطب کا۔ ذاکر صاحب کی نثر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو نہیں بھولتے۔ ان کی نثر میں ان کی ذات کچھ اس طرح سے پنہاں ہے کہ مخاطب ہی مخاطب نظر آتا ہے۔ یہ خوبی ہر جگہ چاندنی کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور ان کی تحریر کی تاثیر اور دل نشینی میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ مخاطب سے براہِ راست باتیں کرتے ہیں۔ گفتگو کا یہ انداز ان کے اسلوب کی جان ہے۔

محمد مجیب نے تعلیمی خطبات کے پیش لفظ میں صحیح لکھا ہے

"ان خطبات میں انداز تقریر کا ہے، تحریر کا نہیں۔ ان میں کوشش کی گئی ہے کہ آپ سے براہ راست بات کہی جائے"۔

(ص ۷،۸)

یہاں ذاکر صاحبؒ کے اسلوب کے تجزیے کے لیے مندرجۂ ذیل اقتباسات کو استعمال کیا جائے گا

(الف)

اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے، اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقوے کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں، اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے۔ چنانچہ ہمارے نئے مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی کہ جب تک ان کے ارد گرد، ان کے اپنے گھر میں غلامی رہے گی اور افلاس، فلاکت رہے گی، اور جہل، بیماریاں رہیں گی اور بد کرداریاں، پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں، یہ چین کی نیند نہ سوئیں گے، اور اپنے بس بھر ان کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے۔ یہ روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے، پر اُن کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی بلکہ اپنے دین کی اور وطن کی خدمت ہوگی جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی، دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی۔ یہ اپنے دینی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی کہ کبھی دنیا اسے جنت نشاں کہتی تھی، پر جو آج بے شمار انسانوں کے لیے دوزخ سے کم نہیں، سیوا کریں گے، اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید، غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمٰن و رحیم، رزاق و کریم، حیّ و قیوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچادیا ہے کہ ان کا وجود محدود

نگاہوں کو اس کی شانِ ربوبیت پر ایک دھبا سا معلوم ہوتا ہے۔
(تعلیمی خطبات ص ۵۳۔۵۵)

(ب)

"یہ نصب العین یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد کی جتنی تعداد اپنا پیٹ پال لے، سرکاری نوکریاں پاپا کر آرام، چین، اور ہاں تھوڑی سی، 'حکومت' کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے کے قابل ہو جائے، اچھا ہے۔ یہ چند افراد اپنی خوش حالی کا معیار جس قدر بڑھالیں اتنی ہی قوم خوش حال سمجھی جائے، اس راہ میں جو رکاوٹیں ہوں وہ ہر طرح کم کی جائیں، مستقبل کے مشتبہ منصوبوں سے حال کی یقینی بہرہ مندیوں میں حرج نہ ہو اور قومی آخرت کا تصور انفرادی دنیا کے عیش میں خلل نہ ڈالنے پائے۔ معاشرت بدلی جائے، اپنی پرانی معاشرت بری ہے اور بری اس لیے ہے کہ ایک بااقبال صاحبِ اقتدار قوم کی معاشرت سے مختلف ہے۔ سیاست سے بے تعلقی رکھی جائے، اس لیے کہ انفرادی ترقی و ترفع کے لیے اپنی جماعت کے سیاسی اقتدار کی ضرورت کچھ بہت واضح نہ تھی۔ حکومت کی جو شکل بھی ہو ہو، بس وہ امن قائم رکھ سکے، محکوموں کے معاملاتِ باہمی میں انصاف کر سکے، نوکریاں دے، چند افراد کو مراتبِ بلند تک پہنچائے کہ اس کا کام نکلے اور ہماری عزت بڑھے۔ مذہب، کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا، چھوٹتا تو کیسے، ضرور قائم رکھا جائے، مگر اس طرح کہ دوسرے ارادوں میں بھی مانع نہ ہو، اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ معاملات پر کہ اہلِ دنیا سے متعلق ہیں، اس کی تعلیمات اور ان کی حکمتوں کو زیادہ نہ ابھارا جائے، چپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہلِ دُنیا کے اسالیبِ عمل کو اختیار کر لیا جائے"۔
(تعلیمی خطبات ص ۳۹، ۴۰)

(ج)

"لیکن اس کے مقابلے میں ایک دوسرا خیال بھی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی زیادہ صحیح بھی ہے، یعنی یہ کہ اصلی چیز اور ابتدائی چیز سماج ہے اور اکیلا آدمی، فرد اس کے سہارے اور اسی کے لیے ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ سماج کی حیثیت جسم کی ہے اور اکیلا آدمی یا چھوٹے چھوٹے سماجی گروہ اس جسم کے حصے ہوتے ہیں۔ جسم کے حصوں کو جسم

سے اور پتھروں کے ڈھیر کو پتھروں سے جو تعلق ہے، اس کا فرق ظاہر ہے۔ اس خیال کے مطابق میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں۔ اکیلا آدمی بطور جانور کے سمجھ میں آسکتا ہے، مگر پورے انسان کی حیثیت سے، جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے، اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جاسکتا ہے۔ ذہنی زندگی کے لیے جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود لازمی ہے، مگر اس حد تک کہ وہ کل جسم سے وابستہ ہے اور اس کے اندر اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایک حصے کے کٹ جانے سے جسم میں کمی آجاتی ہے، مگر وہ باقی رہ سکتا ہے، مگر حصہ جسم سے الگ ہو کر باقی بھی نہیں رہ سکتا۔ درخت میں ہر ڈالی اور پتی بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے، لیکن ڈالی یا پتی کے ٹوٹ جانے سے درخت ختم نہیں ہوتا، درخت سے الگ ہو کر ڈالی اور پتی کے لیے سوائے فنا کے اور کچھ نہیں"۔

(تعلیمی خطبات ص ۱۳، ۱۴)

(د)

"تعلیمی نظام ہمارے ہاتھ میں ہو تو اس وقت بھی کیا مدرسے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لیے قائم ہوا کریں گے اور ان کا مقصد بھی تندرست اچھے سچے آدمی پیدا کرنے کی جگہ چلتے پھرتے کتب خانے پیدا کرنا ہوگا؟ کیا اس وقت بھی بچوں کی قدرتی صلاحیتوں کا خیال کیے بغیر سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جایا کرے گا اور اس طرح قوم کی ذہنی قوت کو، کہ اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، برباد کیا جائے گا؟ یا مختلف صلاحیت والوں کے لیے مختلف قسم کے مدرسے ہوں گے جن میں ابتدائی تعلیم کے بعد بچے بھیجے جاسکیں گے اور اپنے خاص رجحانِ ذہنی کے مطابق تعلیم پائیں گے۔ کیا اس وقت بھی مدرسے اور قوم کی زندگی میں اتنا ہی کم تعلق ہوگا جیسا کہ اس وقت ہے، یا بچپن ہی سے ایسے موقعے بھی ملا کریں گے، جن سے ہر ہندوستانی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ قوم کی سیوا کر کے ہی وہ اپنی ترقی کی راہ نکال سکتا ہے؟ کیا اس وقت بھی ہمارے مدرسے خود غرضی اور شخصی مقابلے ہی کے عملی سبق یاد کریں گے اور دوسروں کی خدمت اور مدد کے موقعے ان میں ناپید ہوں گے؟ کیا اس وقت بھی مدرسوں کو بس اس سے سروکار

ہو گا کہ علم سکھا دیا لیکن علم کے برتنے اور سیرت پر اثر انداز ہونے کا کوئی سامان نہ ہو گا؟"۔

(تعلیمی خطبات ص ۲۴)

اس تحریر میں وہ کیا چیز ہے جو ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے؟ جن مسائل کا ذکر ہے وہ علمی اور ملکی اور قومی نوعیت کے ہیں، لیکن نثر بوجھل نہیں۔ لکھنے والے کی ذات الفاظ کے پیچھے چھپی ہوئی ہے، لیکن اس کی کشش ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ زبان علمی ہے، لیکن انداز خشک کتاب کا سا نہیں۔

اقتباس (الف) میں جملوں کے دروبست اور افعال کے استعمال کو دیکھیے۔ پہلے جملے کے چار کلمے جو "اگر" سے شروع ہوئے ہیں اور حال پر ختم ہوئے ہیں، فوراً توجہ کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔ حال کا یہ صیغہ بعد کے دو کلموں میں بھی جاری رہا ہے۔ اس کے بعد "چنانچہ" سے فعل کے استعمال کا رُخ مستقبل میں بدل گیا ہے اور آخر تک یہی رہا ہے۔ حال اور مستقبل کے یہ صیغے اردو فعل کی سادہ ترین شکلوں میں سے ہیں۔ اقتباس (ب) میں بنیادی خیال یعنی "نصب العین" کی وضاحت کے لیے شروع میں مضارع "پیٹ پال لے" "قائل ہو جائے" استعمال ہوئے ہیں۔ اب پورے پیراگراف میں افعال کو دیکھتے جائیے، معلوم ہو گا کہ مضارع کے استعمال کی جو فضا پہلے جملے میں تیار ہو گئی تھی، وہ پورے پیراگراف میں برقرار رکھی گئی ہے۔ یہی عالم اقتباس (ج) اور (د) کا ہے۔ اقتباس (د) کی فعلیہ فضا استفہامیہ ہے، اور جہاں تک بنیادی معنوی نکتے کی وضاحت کی ضرورت تھی، فعل کا استعمال استفہامیہ انداز سے ہوا ہے۔ اقتباس (ج) میں بھی شروع سے آخر تک فعل کا سادہ صیغہ یعنی حال استعمال ہوا ہے۔

ذاکر صاحب کی تحریروں کو کہیں سے کھول کر پڑھیے، اوّل تو فعل کے استعمال میں مسلسل ہمواری ملے گی یعنی تبدیلیاں بار بار اور یک لخت نہیں ہوتیں اور استعمال میں ایک طرح کا تواتر پایا جاتا ہے۔ دوسرے ہر فعل کے استعمال کی انتہائی سادہ شکلیں سامنے آئیں گی۔ استفہامیہ سے توجہ برقرار رکھنے میں، مضارع اور حال سے تصویر کھینچنے میں اور مستقبل سے امید ابھارنے میں جو مدد ملتی ہے، ذاکر صاحب کو اس کا گہرا احساس تھا۔ ان کے ہاں افعال کی ان سادہ اور ہموار شکلوں کے استعمال کی بڑی وجہ مخاطب کا تصور

ہے، جو ان کے ذہن میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ سادہ افعال کے ہموار استعمال سے مخاطب تک بات پہنچانے کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے اسلوب میں ان کے جملوں کی نحوی ساخت کا کیا درجہ ہے، اس سلسلے میں مزید بحث کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کی نثر کے بارے میں "گفتگو کا انداز" اور "خطاب کا انداز" کی جو ترکیبیں زیرِ نظر مضمون میں استعمال کی گئی ہیں، ان سے متعلق چند باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔ اوّل یہ کہ "گفتگو کا انداز" کے تصور میں "گفتگو کا لہجہ" شامل نہیں۔ گفتگو کے انداز میں نثر لکھنے کے لیے ضروری نہیں کہ اسے گفتگو کے "لہجے" میں لکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ "خطاب کا انداز" کے تصور میں "خطابت" شامل نہیں۔ "خطاب کا انداز" سے مراد محض یہ ہے کہ مخاطب ہر وقت نظر میں رہتا ہے اور متکلم اور مخاطب میں کوئی تیسرا واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس "خطابت" سے مراد ایک طرح کے جذباتی، جوشیلے اور مرعوب کرنے والے اسلوب سے ہے۔ ذاکر صاحب کا اسلوب اس کی واضح ضد ہے، اس کی بنیاد ہی تھمے ہوئے جذبات اور سنبھلی ہوئی عقلیت پر ہے۔ ان کی تحریروں کے چار پانچ سو صفحوں میں ہمیں اس عام رنگ سے ہٹے ہوئے صرف دو مختصر سے پیراگراف مل سکے ہیں

"کیا اسلام کے پیشِ نظر جماعت کا یہی تصور ہے کہ وہ الگ الگ افراد کا بس ایک اتفاقی اور افادی مجموعہ ہے؟ کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے؟ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے؟ نہیں اور ہزار بار نہیں"۔

(تعلیمی خطبات ص ۴۲)

"اور اگر آپ اپنی قوم کی موجودہ پستی پر مطمئن ہیں تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ آپ کے ثانوی مدرسے ہی کیا آپ کا سارا تعلیمی نظام بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں ذرا تبدیلی نہ کیجیے، وہ معاشرت میں اندھی تقلید، مذہب میں کھوکھلی رسمیت، سیاست میں محکومیت پسندی کے پیدا کرنے، علم میں ذوقِ تحقیق سے اور فنون میں ذوقِ تخلیق سے

نوجوانوں کو بے بہرہ رکھنے اور کمزور جسم، بے نور دماغ اور بے سوز دل پیدا کرنے کے نہایت کامیاب کارخانے ہیں"۔

(تعلیمی خطبات ص ۴۴)

یہ کس کی آواز ہے؟ ان جملوں میں تاکید و تنبیہہ کا جو انداز ہے، وہ کس کا ہے؟ لہجے کی اُٹھان میں مقرّر کی علمی اور ذہنی برتری کا جو تصوّر ہے اور "بشارت" دینے میں جو طنز ہے وہ کس کے اسلوب کی یاد دلاتا ہے؟ ان جملوں میں ابوالکلام آزاد کے اندار کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ کسی حد تک یہ خطابت کا اندار ہے۔ یہ ذاکر صاحب کا اپنا رنگ نہیں۔ ذاکر صاحب کے ہاں تیزی اور طغیانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ برتری کے بگولوں اور علمیت کی آندھی دونوں سے دور رہتے ہیں۔ ان کی نثر تو جوئے دل نشیں کی طرح نرم خرامی کی کیفیت رکھتی ہے۔ وہ مخاطب کا احترام کرتے ہیں، اس کی کم علمی پر طنز نہیں کرتے، اس کے ذہن کو ماؤف کر کے اسے اسیر نہیں بناتے، بلکہ اسے جگا کر اس کے دل و دماغ سے رابطہ قائم کرتے ہیں' یہ "خطاب کا انداز" ہے، "خطابت" نہیں۔

ذاکر صاحب کی نثر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چاہے خیال کتنا ہی مجرّد ہو اور موضوع چاہے کتنا ہی فلسفیانہ ہو، کیا مجال کہ ان کی نثر میں کہیں سے پیچیدگی یا ژولیدگی پیدا ہو جائے۔ وہ فلسفیانہ مباحث کو بھی اسی سادگی اور صفائی سے پیش کرتے ہیں، جس طرح سامنے کی باتیں کر رہے ہوں۔

اس سلسلے میں اقتباس (ج) دوبارہ ملاحظہ ہو۔ سماج اور فرد کے تعلق کی بحث ہے، لیکن کہیں کوئی نامانوس لفظ یا ترکیب استعمال نہیں ہوئی۔ عربی فارسی جمع سے بھی مدد نہیں لی گئی اور عطف و اضافت بھی کہیں نہیں آئے۔ مستعار الفاظ بھی جتنے استعمال ہوئے ہیں، کثیر استعمال الفاظ کی ذیل میں آتے ہیں۔ نیز جملوں کی ترتیب اور ان کا نحوی ڈھانچہ انتہائی سادہ اور صاف ہے۔

سادگی سے عام طور پر چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب کے ہاں سادگی کی بنیاد چھوٹے جملوں کے استعمال پر نہیں۔ اوپر کے اقتباسات میں سے کسی ایک کو اس نقطۂ نظر سے ایک بار پھر غور سے دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ذاکر صاحب کے جملے زیادہ تر خاصے طویل ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود نثر پیچیدہ یا

مشکل نہیں ہوتی۔ یہاں اس مقصد سے اقتباس (الف) کا از سر نو تجزیہ کیا جاتا ہے

(الف)

"اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں/ اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں/ جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کردے/ اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقوے کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں/ اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں// تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے/ جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں/ اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے # چنانچہ ہمارے نئے مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی/ کہ جب تک ان کے ارد گرد، ان کے اپنے گھر میں غلامی رہے گی اور افلاس/ فلاکت رہے گی اور جہل/ بیماریاں رہیں گی اور بد کرداریاں/ پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں/ یہ چین کی نیند نہ سوئیں گے/ اور اپنے بس بھر ان کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے # یہ روٹی بھی کمائیں گے/ اور نوکریاں بھی کریں گے// پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی/ بلکہ اپنے دین اور وطن کی خدمت ہوگی/ جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی/ دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی # یہ اپنے دینی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دلیس کی کہ // کبھی دنیا سے جنت نشاں کہتی تھی/ پر جو آج بے شمار انسانوں کے لیے دوزخ سے کم نہیں // سیوا کریں گے/ اور ایسا بنائیں گے/ کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید، غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمٰن و رحیم، رزّاق و کریم، حیّ و قیّوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا/ کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے/ بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے/ آج اس حال کو پہنچادیا ہے/ کہ ان کا وجود محدود نگاہوں کو اس کی شانِ ربوبیت پر ایک دھبّا سا معلوم ہوتا ہے#"۔

بیس سطروں کے اس اقتباس میں صرف چار جملے ہیں۔ پہلے جملہ جو "اگر ہم دنیا سے شروع ہو کر" پھر واپس جائیں گے" پر ختم ہوتا ہے، چھ سطروں کا ہے۔ دوسرا "چنانچہ ہمارے " سے شروع ہو کر "تن من دھن سب کھپائیں گے" پر ختم ہوتا ہے۔ یہ بھی چھ سطروں کا ہے۔ اگرچہ تیسرا جملہ "یہ روٹی بھی کلی بھی کھلے گی"

صرف تین سطروں کا ہے، لیکن چوتھا جملہ "یہ اپنے دینی نصب العین .دھبا سا معلوم ہوتا ہے" سات سطروں کا ہے۔ اس طرح کے جملوں کو اردو زبان کے طویل ترین جملوں میں شامل سمجھنا چاہیے۔ سات سطروں کے جملے کا مطلب ہے عام سائز کی کتاب کے تہائی صفحے کا جملہ! حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قدر طویل جملوں کے باوجود ذاکر صاحب کی نثر صاف اور عام فہم ہوتی ہے۔ اس کا راز کیا ہے؟۔

پہلے جملے پر نظر ڈالیے جو چھ سطروں کا ہے۔ یہ شروع ہوتا ہے "اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں"۔ اس کلمے کا PHRASE STRUCTURE یعنی نحوی ساخت کیا ہے؟

ہم مجبور ہیں	S → NP + VP
ہم مٹانے پر مجبور ہیں	VP → N + Adj + V
ہم غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں	NP → $N_1 + N_2$
ہم ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں	NP → $N_1 + M + N_2$
ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں	NP → N_1 Adv + M + N_2
اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں	NP → C + N_1 + Adv + M + N_2

(Conjunction = C حرف ربط، Noun Phrase = NP کلمۂ اسمیہ، Verb Pharse=VP کلمہ فعلیہ، Modifier = M صفاتیہ)

بالکل یہی ساخت "اگر ہم انسانیت " سے شروع ہونے والے دوسرے کلمے کی Phrase ہے۔ اس کے بعد "جس میں " سے شروع ہونے والا تابع کلمۂ ضمیریہ Re-lative Phrase ہے، جس میں دوسرے کلمے کے Phrase کے اسم "معاشی تنظیم" کی تعریف ہے۔ پھر "اگر ہم دولت " سے شروع ہونے والا تیسرا کلمہ ہے اور اس کے بعد "اگر ہم نسل " سے شروع ہونے والا چوتھا کلمہ۔ آخری دونوں کلموں کی نحوی ساخت پہلے دو کے انداز پر ہے۔ گویا ان چاروں کلموں میں ساخت کے اعتبار سے نحوی متوازیت STRUCTURAL PARALLELISM ہے۔ اس کے بعد معنوی اعتبار سے آدھا جملہ ختم ہو گیا ہے۔ اس سارے نصف جملے کی نحوی ساخت بنیادی طور پر وہی ہے جو چار کلموں کی تھی، یعنی اگر ہم (فعل) ہیں۔

اس کے بعد جملہ کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس کا پہلا کلمہ خاصا طویل ہے:
ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے۔
اس کی نحوی ساخت ملاحظہ ہو
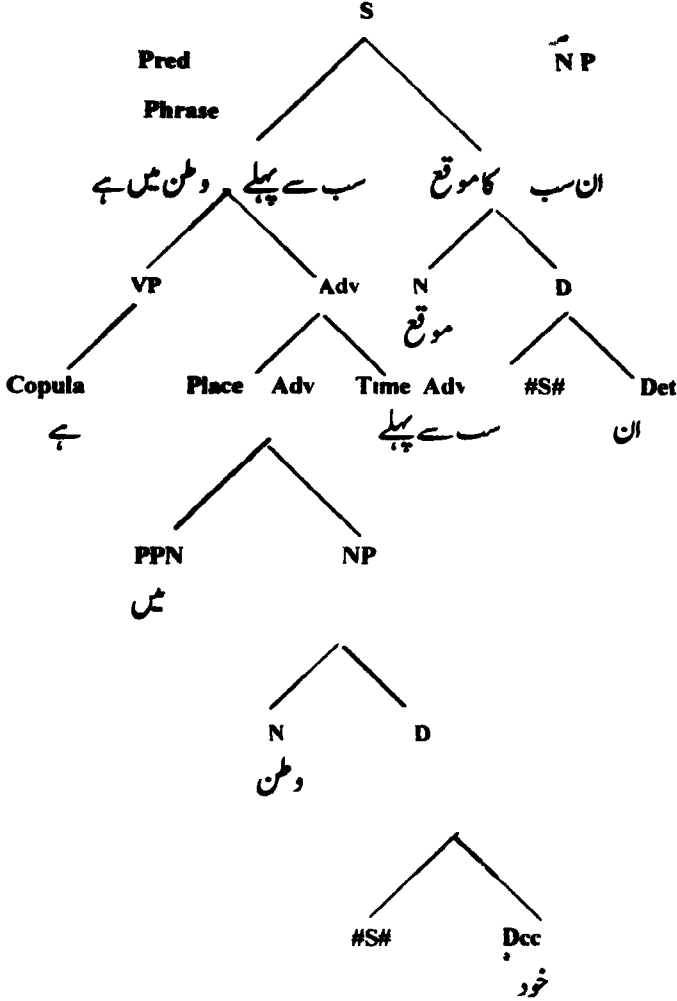
اس تجزیے سے ظاہر ہے کہ اس طویل کلمے کے دو حصے ہیں اور ان دونوں کی

اندرونی ساخت (DEEP STRUCTURE) میں دو بنیادی جملے (EMBEDDED SEN-TENCES) ہیں جس سے کلے کے دونوں حصوں میں ایک طرح کی نحوی متوازیت STRUCTURAL PARALLELISM پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے بعد دو تابع کلمے ہیں جو دونوں "جس" سے شروع ہوتے ہیں اور جن دونوں کی ساخت یوں ہے

جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں۔ P+N2 + N1+ V

جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے P+ N2+N1+ (A) + V

ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بھی ساخت کے اعتبار سے نحوی متوازیت ہے۔

جملے کے پہلے حصے میں پانچ کلمے ہیں، دوسرے میں تین ہیں۔ پہلے پانچ میں چار کی ساخت ایک جیسی ہے اور پانچواں تابع کلمہ ہے۔ دوسرے حصے میں دو تابع کلمے ہیں اور دونوں کی ساخت ایک جیسی ہے۔ گویا پورے جملے میں نحوی متوازیت (STRUCTU-RAL PARALLELISM) چار کلموں میں اور دو کلموں میں اور بیچ کے طویل کلمے میں کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ جملہ طویل ہونے کے باوجود مشکل یا پیچیدہ نہیں معلوم ہوتا اور اس میں چھوٹے چھوٹے جملوں کا لطف پیدا ہو گیا ہے ___ ذاکر صاحب کے ہاں نحوی متوازیت کا گہرا تعلق اسلوب کی اس اندرونی موسیقیت سے ہے جس کی موجودگی یا غیر موجودگی اسلوب کو آسان یا مشکل بنانے میں مدد کرتی ہے۔ معنوی اعتبار سے جملے کے پہلے نصف میں جو سوال بار بار مختلف شکلوں میں ذہن پر ہتھوڑے کی طرح پڑتا رہا ہے، دوسرے نصف میں اس کا جواب وطن کی خدمت کے ٹھوس معنوی پیکر کی شکل میں واضح طور پر سامنے آگیا ہے۔

اب دوسرے جملے کو لیجیے۔ اس کے کلمات کی ساخت اور ترتیب نیچے کے نقشے سے واضح ہے

چنانچہ (ہمارے نئے مدرسوں کی) تعلیم نوجوانوں کے (دل میں جماعتی خدمت کی) لگن لگائے گی کہ جب تک ان کے ارد گرد (ان کے اپنے گھر میں)

غلامی رہے گی اور افلاس

فلاکت رہے گی اور جہل

بیماریاں رہیں گی اور بدکرداریاں
پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں
یہ (چین کی نیند) نہ سوئیں گے

اب یہ بات ظاہر ہے کہ ذاکر صاحب کے طویل جملوں کے عام فہم ہونے کا راز جملے کی سادہ نحوی ساخت اور اس ساخت کی متوازیت یعنی جملے کے داخلی توازن اور تکرار اور ٹھوس معنوی پیکروں کے استعمال میں پوشیدہ ہے۔ اب آخری دو جملوں کو بھی ملاحظہ کر لیا جائے۔ ان کی ساخت سے بھی اسی تجزیے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس اقتباس میں کلموں کی نحوی تقسیم کو ایک آڑی لکیر سے، معنوی موڑ کو دو آڑی لکیروں سے اور نحوی متوازیت کو پورے کلمے کے نیچے کی لکیر سے ظاہر کر دیا گیا ہے جملے کی حد بندی # سے کی گئی ہے۔ تیسرے جملے میں "پیٹ کی آگ" اور "دل اور روح کی کلی"، اور چوتھے جملے میں "جنت نشاں" اور "دوزخ"، اور "بیمار، بے کس" اور "رحمن ورحیم" کے متضاد معنوی پیکروں سے جو کام لیا گیا ہے، اس کی اہمیت ظاہر ہے۔

اقتباس (الف) جس کا تجزیہ اوپر پیش کیا گیا، مستثنیات میں سے نہیں۔ ذاکر صاحب کی تحریروں کو کہیں سے کھول کر دیکھیے، جملے کے اندر کلموں کی نحوی متوازیت اور ان کے باہمی ربط و توازن کا تقریباً یہی انداز ملے گا۔ ذاکر صاحب کے ہاں چھوٹے جملے بھی کہیں کہیں ملتے ہیں، لیکن زیادہ تر طویل جملوں کے اندر نحوی متوازیت ملتی ہے جس سے طویل جملوں میں چھوٹے جملوں کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مزید ثبوت کے لیے اقتباس (ب) کو نشان زد کر کے دوبارہ نیچے پیش کیا جاتا ہے۔ اقتباس (الف) کی وضاحت کے بعد اس تجزیے کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کلموں کی نحوی تقسیم کو نظر میں رکھنے سے تجزیے کے نتائج خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

(ب)

"یہ نصب العین یہ تھا // کہ اس ملک کے مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد کی جتنی تعداد اپنا پیٹ پال لے / سرکاری نوکریاں پا پا کر آرام، چین، اور ہاں تھوڑی سی، 'حکومت' کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے کے قابل ہو جائے // اچھا ہے # یہ چند افراد اپنی خوش حالی کا معیار جس قدر بڑھا لیں / اتنی ہی قوم خوش حال سمجھی جائے /// اس راہ میں

جو رکاوٹیں ہوں/وہ ہر طرح کم کی جائیں// مستقبل کے مشتبہ منصوبوں سے حال کی یقینی بہرہ مندیوں میں حرج نہ ہو/اور قومی آخرت کا تصور انفرادی دنیا کے عیش میں خلل نہ ڈالنے پائے# معاشرت بدلی جائے//اپنی پرانی معاشرت بُری ہے/اور بُری اس لیے ہے/کہ ایک بااقبال صاحبِ اقتدار قوم کی معاشرت سے مختلف ہے#سیاست سے بے تعلق رکھی جائے/اس لیے کہ انفرادی ترقی وترفع کے لیے اپنی جماعت کے سیاسی اقتدار کی ضرورت کچھ بہت واضح نہ تھی# حکومت کی جو شکل بھی ہو ہو//بس وہ امن قائم رکھ سکے/محکوموں کے معاملاتِ باہمی میں انصاف کرسکے/نوکریاں دے/چند افراد کو مراتبِ بلند تک پہنچائے//کہ اس کا کام نکلے/اور ہماری عزت بڑھے#مذہب//کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا/چھوٹتا تو کیسے//ضرور قائم رکھا جائے//مگر اس طرح/کہ دوسرے ارادوں میں بھی مانع نہ ہو/اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے# معاملات پر//کہ اہلِ دنیا سے متعلق ہیں//اس کی تعلیمات اور ان کی حکمتوں کو زیادہ نہ ابھارا جائے/چپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہلِ دنیا کے اسالیبِ عمل کو اختیار کرلیا جائے#"

اب تک جو نمونے پیش کیے گئے، وہ علمی نثر کے تھے۔ ایک اقتباس بیانیہ نثر کا بھی دیکھ لیا جائے

" جنگل ہی جنگل تھے اور پھر پہاڑیاں ہی پہاڑیاں۔ ساتویں جنگل کے پیچھے اور ساتویں پہاڑی کے پرے ایک مچھیرا رہتا تھا، جوان اور خوبصورت۔ وہیں ایک گڈریا رہتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی، جیسے چاند کا ٹکڑا۔ یہ بچی بھیڑیں چرایا کرتی تھی۔ غریب اور بھولی بھالی تھی، جیسی اس کی بھیڑیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ لڑکی کی نظر میں مچھیرا کسی شہزادے سے کم نہ تھا اور مچھیرے کے نزدیک کوئی شہزادی اس غریب لڑکی کی برابری نہ کرتی تھی، مگر تھے دونوں بہت غریب۔"

("سچی محبت" مشمولہ ابو خاں کی بکری اور دوسری کہانیاں)

اس نثر کا عام رنگ بیانیہ ہے، لیکن دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ انداز کہانی لکھنے کا نہیں، سنانے کا ہے یعنی مخاطب نظر میں ہے اور انداز گفتگو کا ہے۔ دوسرے اگرچہ جملے چھوٹے چھوٹے ہیں، لیکن نحوی متوازیت یہاں بھی موجود ہے۔ خط کشیدہ کلموں کو

دیکھیے۔ اگرچہ پہلا کلمہ "پھر پہاڑیاں ہی پہاڑیاں" حصریہ ہے، دوسرا "جوان اور خوبصورت" صفاتیہ ہے، اس کے بعد تیسرا "جیسے چاند کا ٹکڑا" چوتھا "جیسی اس کی بھیڑیں" اور پانچواں "مگر تھے دونوں بہت غریب" تینوں صفاتیہ ہیں، لیکن دراصل پانچوں کلمے اختتامیہ ہیں۔ اصل جملے جو اسم و فعل سے مکمل ہیں، ان سے فوراً پہلے آتے ہیں۔ ان کلموں میں سے پہلے چار میں فعل سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ پہلے آنے والے جملے کی معنوی توسیع کے لیے یا بات کا وزن بڑھانے کے لیے یا اس پر زور دینے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے جملے کے ساتھ مل کر یہ دو دو کا سیٹ بناتے ہیں، اور اس لحاظ سے ان میں اور ان سے پہلے آنے والے جملے میں نحوی متوازیت ہے جس سے نثر میں ایک طرح کا داخلی توازن اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔

جملوں کے نحوی تجزیے کے بعد ایک نظر اگر الفاظ و تراکیب کے استعمال پر بھی ڈال لی جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اسلوبیات (STYLISTICS) میں تجزیے کی معروضیت کے لیے ضروری ہے کہ نثر کو کہیں سے بھی لیا جائے۔ اس لیے موضوعی طور پر نئے اقتباسات منتخب کرنے کے بجائے ایک بار پھر ہم ان چار اقتباسات سے کام لے سکتے ہیں، جنھیں شروع میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اردو الفاظ کا ایک تجزیہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مصنف کی تحریر میں مستعار اور غیر مستعار الفاظ کا باہمی تناسب معلوم کیا جائے۔ لیکن چونکہ اردو کی خوش آہنگی عربی، فارسی اور دیسی الفاظ کے باہمی تناسب سے کہیں زیادہ مانوس مستعار اور غیر مانوس مستعار الفاظ کے باہمی تناسب پر منحصر ہے، اور مانوس اور غیر مانوس کا یہ تصور خاصا اضافی اور وجدانی ہے، اس لیے ایسا تجزیہ زیادہ کارآمد نہ ہوگا۔ چنانچہ زیرِ نظر تجزیے کو ہم صرف عطف و اضافت اور عربی فارسی جمع کے استعمال کی بحث تک محدود رکھیں گے۔

عطف اور اضافت کا استعمال اردو کی ان خصوصیات میں سے ہے جو اردو کو ہندی سے ممتاز کرتی ہیں، لیکن عطف و اضافت کا حد سے بڑھا ہوا استعمال بھی مستحسن نہیں۔ مندرجۂ بالا اقتباسات میں اس کی مثالیں یہ ہیں

(الف) شانِ ربوبیت، امیر و غریب، رزّاق و کریم، رحمٰن و رحیم، حیّ و قیوم۔ کل پانچ بار
(ب) صاحبِ اقتدار، معاملاتِ باہمی، مراتبِ بلند، اہلِ دنیا، اسالیبِ عمل، ترقی و ترفع۔ کل چھ بار

(ج) ــــــ   صفر

(د) رجحانِ ذاتی   صرف ایک بار

اردو کی علمی نثر میں عطف و اضافت کے استعمال کی جو بھی حدود ہوں، مندرجۂ بالا تجزیے کی روشنی میں ظاہر ہے کہ ذاکر صاحب کے ہاں عطف و اضافت کا استعمال ان حدود کے اندر ہی قرار پائے گا۔

اب جمع کی شکلوں کو لیجیے

	مستعار جمع	مستعار الفاظ کی دیسی جمع
(الف)	تعصبات، فرائض	مدرسوں، نوجوانوں، بیماریاں، مایوسیاں، بدکرداریاں، پست حوصلگیاں، زیادتیوں، کوتاہیوں، نگاہوں۔
(ب).	معاملات، مراتب	منصوبوں، بہرہ مندیوں، محکوموں، صدیوں، حکمتوں
	تعلیمات، اسالیب	حصّوں، معنوں
		حجتوں، صلاحیتوں

(ج) صفر

(د) صفر

آخر میں ایک نظر اس نثر کی صوتیات پر بھی ڈال لی جائے۔ اس بحث میں ث، ص، ط، ح، ع وغیرہ آوازوں کو نہیں لیا جائے گا، کیوں کہ ان کی بنیادی آوازیں بالترتیب س، ت، ہ اور مختلف مصوتے اردو کی دیسی آوازوں سے ہم صوت ہیں، اور صوتیاتی سطح پر ان کی کوئی امتیازی حیثیت نہیں۔ البتہ ز (جو اردو میں ذ، ظ اور ض کی بھی آواز ہے) ژ، ف، خ، غ اور ق کو لیا جائے گا جو اردو کی مستعار امتیازی آوازیں ہیں اور اردو کو ہندی سے ممیز کرتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں اردو کی معکوسی آوازوں ٹ، ڈ، ڑ اور ہکار آوازوں (بھ، پھ، تھ، دھ وغیرہ) کو لیا جائے گا جو اردو کی غیر مستعار امتیازی آوازیں ہیں اور اردو کو فارسی سے ممیز کرتی ہیں۔ اردو میں ہکار آوازوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے اور یہ تمام بندشی آوازوں کے علاوہ م، ن، ہ اور ی کے ساتھ اور تینوں معکوسی آوازوں کے ساتھ بھی استعمال ہوتی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی اردو میں ان کا وقوع (OCCURRENCE) بہت زیادہ نہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں الفاظ کے دو گروہ خاص ہیں، اسما اور اسمائے صفت اور

دوسرا افعال۔ مستعار الفاظ کی بڑی تعداد پہلے گروہ سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس میں دیسی آوازوں کا استعمال قدرتی طور پر محدود ہے۔ رہے افعال تو اگرچہ اردو افعال بنیادی طور پر دیسی ہیں، لیکن ہکار آوازوں کا استعمال باقاعدگی سے صرف امدادی فعل کی ماضی میں ہوتا ہے، اس کے علاوہ اردو میں ہکار اور معکوسی آوازوں کا استعمال بہت زیادہ نہیں۔ اس لیے قیاساً یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ اردو میں ممتاز دیسی اور ممتاز مستعار اصوات کا باہمی تناسب شاید نصف نصف کا نہیں، اور علمی زبان میں تو دیسی ممتاز اصوات کا یہ تناسب اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کی نثر سے اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔ نمونے کے لیے اقتباس ب کو جہاں وہ دوبارہ پیش ہوا ہے، ان آوازوں کے لیے نشان زد کر دیا گیا ہے۔ (✓ کا نشان مستعار امتیازی آوازوں اور x کا نشان دیسی امتیازی آوازوں پر لگایا گیا ہے)۔ باقی اقتباسات کو نشان زد نہیں کیا گیا، صرف اعداد پیش کیے جا رہے ہیں

	مستعار آوازیں	دیسی آوازیں
(الف)	۳۸	۲۷
(ب)	۴۱	۲۳
(ج)	۳۶	۲۷
(د)	۳۸	۱۳
	۱۵۳	۹۰

گویا تناسب ۳ ۲ سے قدرے زیادہ ہوا۔ اردو کے اسما اور اسمائے صفت کی بڑی تعداد کے مستعار ہونے کے پیش نظر اس تناسب کو اردو کے بنیادی اسلوب کی حدود کے اندر سمجھنا چاہیے۔

اس پورے تجزیے سے ظاہر ہے کہ خواہ جملے کی نحوی ساخت اور اس کے اجزا کی داخلی تنظیم ہو، خواہ الفاظ کی نوعیت یا اصوات کا باہمی تناسب، ذاکر صاحب کا اسلوب سادگی، ہمواری اور ہم آہنگی کی بہت اچھی مثال فراہم کرتا ہے۔

اگرچہ نثر میں آوازوں کو چن چن کر اور لفظوں کو گن گن کر نہیں لکھا جاتا، لیکن نثر میں یہ خوبیاں اتفاقاً پیدا ہو جائیں ایسا بھی نہیں۔ ان کے پیچھے تخلیقی مزاج، افتادِ طبع، اور ذاتی پسند و ناپسند کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مشکل نثر لکھنا مشکل اور

آسان نثر لکھنا آسان ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشکل نثر لکھنا نسبتاً آسان ہے اور آسان نثر لکھنا مشکل۔ بغیر خونِ جگر کھائے علمی مباحث کو پانی نہیں کیا جا سکتا۔ ذاکر صاحب اردو کی خوش سلیقگی کے مزاج داں اور اس کی امتزاجی خوش آہنگی کے رمز شناس تھے۔ گفتگو کا انداز، سادہ الفاظ، طویل جملوں میں نحوی متوازیت، اور فعل کے استعمال میں ہمواری، ان کے اسلوب کے بنیادی ارکان ہیں۔ انھوں نے اپنی نثر کے ذریعے جملوں اور ذیلی جملوں میں ربط و توازن کے جو نمونے پیش کیے، افعال کی سادہ شکلوں سے جو کام لیا، اردو کے مختلف الاصل عناصر میں تخلیقی توازن کی جو مثالیں پیش کیں، اور اردو کے فطری امکانات کو بروئے کار لانے اور اس کے جینیس سے انصاف کرنے کی جو کوشش کی، اس کا اعتراف ضروری ہے۔ اردو کے بنیادی اسلوب کا جب بھی جائزہ لیا جائے گا، ذاکر صاحب کی نثری خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

●●●